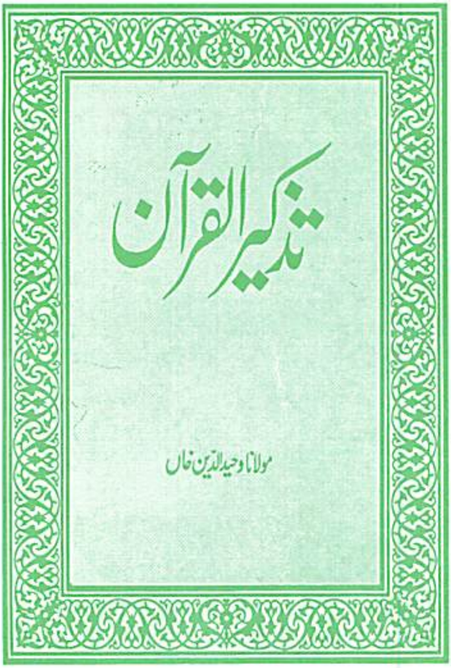
الرسالہ

Al-Risāla

March 2004 • No. 328 • Rs. 10

یہ ایک مہلک غلطی ہے کہ کوئی آدمی اپنے آج پر اپنے کل
کو قیاس کرنے لگے۔



تذکیر القرآن

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپئے (ہارڈ باؤنڈ)

۲۵۰ روپئے (پیپر بیک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 5454
Fax: 2435 7333, 2435 7980
email: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $10/£6 (Air Mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
Al-RISALA FORUM INTERNATIONAL
2665 Byberry Rd.
Bensalem, PA 19020 (USA)
Tel/fax: 215-639-3584
e-mail: caleem@juno.com

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

الرسالہ، مارچ 2004

حکمت قرآن پر منتخب مضامین



اسٹریس مینجمنٹ Stress Management

زندگی میں بار بار مسائل اور مصائب آتے ہیں۔ ایسا ہر مرد اور عورت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس سے کس طرح کامیابی کے ساتھ نپٹا جائے۔ اس کا جواب قرآن کی سورہ نمبر کی ایک آیت میں ملتا ہے۔ اُس کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔ (البقرہ ۱۵۵۔۱۵۶)

مسائل اور مصائب کے وقت کوئی شخص ذہنی تناؤ کا شکار کیوں ہوتا ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ وہ اُس کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جس کو نہ ہونا چاہئے تھا۔ آدمی اگر یہ سمجھ لے کہ جو کچھ پیش آیا ہے وہ خود فطرت کے قانون کے تحت پیش آیا ہے تو وہ کبھی ذہنی تناؤ کا شکار نہ ہو۔ مثلاً اگر آندھی اور بارش آئے تو وہ بھی انسان کے لیے مسئلہ پیدا کرتی ہے۔ مگر آندھی اور بارش کے وقت آدمی ذہنی تناؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اُس کو فطرت کے قانون کے تحت ہونے والا ایک واقعہ سمجھتا ہے اور معتدل انداز میں اُس کا سامنا کرتا ہے۔

یہی معاملہ زندگی کے مسائل اور مصائب کا بھی ہے۔ یہ چیزیں خالق کے تخلیقی منصوبہ کے تحت پیش آتی ہیں۔ وہ انسان کے لیے زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آدمی اگر پیش آنے والے مصائب کو اس حیثیت سے لے تو وہ کبھی ذہنی تناؤ کا شکار نہ ہو۔

مصائب یا مسائل کا سامنا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک، صبر کا طریقہ اور دوسرا، بے صبری کا طریقہ۔ بے صبری کا طریقہ، دوسرے لفظوں میں، منفی ردّ عمل (negative response) کا طریقہ ہے۔ اس کے برعکس صبر کا طریقہ مثبت ردّ عمل (positive response) کا طریقہ۔ ذہنی تناؤ ہمیشہ بے صبری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں صبر کا طریقہ آدمی کو ذہنی تناؤ کا شکار ہونے سے بچا لیتا ہے۔

اس دنیا میں ہر آدمی قانونِ خداوندی، بالفاظِ دیگر قانونِ فطرت کے تابع ہے۔ وہ اپنے آغاز میں بھی اسی قانون کے ماتحت ہے اور اپنے آخر میں بھی اسی قانون کے ماتحت۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی مرد یا عورت جب بھی کسی مسئلہ سے دوچار ہو تو وہ معتدل انداز میں اُس کا سامنا کرے۔ وہ اُس کو اپنے حق میں خیر سمجھ کر اُس کو قبول کرے۔

اس آیت میں مصیبتوں کا مقصد ابتلاء (ولنبلونکم) بتایا گیا ہے۔ ابتلاء کے معنٰی امتحان یا آزمائش ہیں۔ انسانی زندگی میں اس قسم کے امتحان کا مقصد یہ ہے کہ اُس کو حوادث کے درمیان تربیت دے کر زیادہ بہتر انسان بنایا جائے۔ حوادث کسی آدمی کے لیے ترقی کا زینہ ہیں۔ حوادث کے ذریعہ آدمی کا ذہن بیدار ہوتا ہے۔ حوادث کے ذریعہ آدمی کے اندر پختگی آتی ہے۔ حوادث آدمی کو متحرک کرنے کا ذریعہ ہیں۔ حوادث آدمی کے لیے زندگی کے سفر میں مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ حوادث کے بغیر آدمی نامکمل ہے۔ یہ حوادث ہی ہیں جو آدمی کی شخصیت کو مکمل شخصیت بناتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حوادث کا صحیح مقابلہ یہ نہیں ہے کہ اپنے اندر ذہنی عمل کو سپریس کر دیا جائے یا اُس کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ بہت سے لوگ یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ سگریٹ یا شراب کے ذریعہ اُس کو بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مخصوص ورزشوں کے ذریعہ اپنے اندر ذہنی عمل کو معطّل کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ حقیقی زندگی سے فرار (escape) کا کوئی طریقہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ میڈیٹیشن (Meditation) کے ذریعہ اپنے ذہن کو ایک ایسی حالت میں لے جاتے ہیں جس کو ذہنی تخدیر (Intellectual anaesthesia) کہا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے تمام طریقے فطرت کے خلاف ہیں اور جو چیز فطرت کے خلاف ہو وہ کبھی انسان کے لیے مفید نہیں ہوسکتی۔

اکثریت پر اقلیت کا غلبہ

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ایک قدیم واقعہ کا ذکر ہے۔ اس کے تحت فطرت کے ایک ابدی قانون کو بتایا گیا ہے، ایک ایسا قانون جو کبھی بدلنے والا نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی مذکورہ آیت کا ایک حصہ یہ ہے:

’’کتنے ہی چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہ پر غالب آئے ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے‘‘ (البقرہ ۲۴۹)

قرآن کی اس آیت میں چھوٹے گروہ اور بڑے گروہ کے درمیان جس ہونے والے واقعہ کو بتایا گیا ہے وہ کوئی پراسرار بات نہیں، وہ مکمل طور پر ایک فطری واقعہ ہے جو معلوم قانون کے تحت پیش آتا ہے۔ مزید یہ کہ اُس کا تعلق ہر گروہ سے ہے، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔ خواہ وہ ایک ملک کا رہنے والا ہو یا کسی دوسرے ملک کا رہنے والا۔ خواہ وہ ایک زمانہ میں رہنے والا ہو یا کسی دوسرے زمانہ میں رہنے والا۔

اصل یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر اتھاہ صلاحیت موجود ہے۔ مگر ابتدائی طور پر یہ صلاحیت سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ جو چیز اس صلاحیت کو جگاتی ہے وہ صرف ایک ہے، اور وہ چیلنج ہے، اسی چیلنج کی حالت کو قرآن میں عداوت (الاعراف ۲۴) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چیلنج (یا عداوت) کے حالات آدمی کے اندر سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو چیلنج والے حالات پیش نہ آئیں اُن کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں۔ وہ ایک کمتر انسان کی مانند جیتے ہیں اور کمتر انسان کی مانند مر جاتے ہیں۔

چھوٹے گروہ اور بڑے گروہ کے درمیان فرق اسی فطری قانون کی بنا پر پیش آتا ہے۔ کسی سماج میں جب ایک گروہ کم تعداد میں ہو اور دوسرا گروہ زیادہ تعداد میں تو اس فرق کی بنا پر دونوں کو الگ الگ حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک کو صبر کی مشقت سے گذرنا پڑتا ہے اور دوسرا صبر کی مشقت سے بچا رہتا ہے۔ چھوٹا گروہ مسلسل طور پر بڑے گروہ کے مقابلہ میں چیلنج کی حالت میں رہتا ہے۔ اس دباؤ کی بنا پر چھوٹے گروہ کے لوگوں کی صلاحیتیں مسلسل بیدار ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ اپنی برتر پوزیشن کی بنا پر چیلنج یا دباؤ کی صورت حال سے بچا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے اُس کی صلاحیتیں زیادہ بیدار نہیں ہوتیں۔

اس فرق کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹے یا کمزور گروہ کی تخلیقیت (creativity) بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ مسلسل طور پر غیر تخلیقیت (uncreativity) کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ

عمل خاموشی کے ساتھ اور مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ ایک گروہ پورے معنوں میں تخلیقی گروہ (creative group) بن جاتا ہے، اور دوسرا گروہ پورے معنوں میں غیر تخلیقی گروہ (uncreative group) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت ایک فطری حقیقت کو بتاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فئۃ قلیلۃ (غیر محفوظ گروہ) مسلسل اپنی اہلیت کو بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ تعداد کی قلت کے باوجود اپنی برتر صفات کی بنا پر عملاً غالب حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس فئۃ کثیرۃ (محفوظ گروہ) مسلسل طور پر انحطاط کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ وہ باہمی اتحاد، گہری سوچ اور دوررس عمل جیسی صلاحیتوں سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ آخر کار اپنی ہی دنیا میں عملاً مغلوب ہو کر رہ جاتا ہے۔

معاملہ کی کتابت

قرآن کے مطابق، درست معاملہ کی بے حد اہمیت ہے۔ درست معاملہ کسی انسان کے حق پرست ہونے کی پہچان ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو، جب تم کسی مقرر مدت کے لیے اُدھار کا لین دین کرو تو اُس کو لکھ لیا کرو۔ اور اُس کو لکھے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا اللہ نے اُس کو سکھایا، اسی طرح اُس کو چاہیے کہ لکھ دے۔ اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق آتا ہے۔ اور وہ ڈرے اللہ سے جو اُس کا رب ہے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس پر حق آتا ہے بے سمجھ ہو یا کمزور ہو یا خود لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہیے کہ اُس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ کر لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تاکہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اُس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ انکار نہ کریں جب وہ بلائے جائیں۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اُس کو لکھنے میں کاہلی

نہ کرو۔ یہ لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کا طریقہ ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قرین قیاس ہے کہ تم شبہہ میں نہ پڑو۔ لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جس کا تم آپس میں لین دین کیا کرتے ہو تو تم پر کوئی الزام نہیں کہ تم اُس کو نہ لکھو۔ مگر جب یہ سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو، اور کسی لکھنے والے کو یا گواہ کو تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ اور اگر ایسا کرو گے تو یہ تمہارے لیے گناہ کی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرو، اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔ (البقرہ ۲۸۲)

یہ آیت قرآن کی سب سے زیادہ لمبی آیت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باہمی معاملہ میں کتابت کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ معاملات میں ہمیشہ شکایت اور اختلاف کا امکان رہتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ معاملہ کے وقت اُس کو باقاعدہ صورت میں لکھ لیا جائے۔ کتابت معاملہ کا ایک ایسا مستند ریکارڈ ہے جو کسی امکانی اختلاف کو طے کرنے کے لیے ایک یقینی ذریعہ ہے۔ معاملہ کو باقاعدہ تحریر میں لانا سماج کے باہمی اختلاف کو ختم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔

نفسیاتی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ عورت اور مرد کے ذہن کی بناوٹ میں فرق ہے۔ اس فرق کی بنا پر ایسا ہے کہ مرد کے اندر کسی ایک چیز پر فوکس کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ جب کہ عورت کا فوکس پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ امکان ہے کہ ایک عورت کسی معاملہ کو پوری طرح اپنی ذہنی گرفت میں نہ لے سکے۔ اس فرق کے پیش نظر یہ احتیاطی تدبیر بتائی گئی کہ گواہ اگر عورت ہے تو دو عورتوں کو گواہ بنا لو تاکہ ایک عورت دوسری عورت کی تلافی کر سکے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ: واتقوا اللہ و یعلمکم اللہ (اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو تعلیم دیتا ہے)۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اور صحت فکر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ آدمی کے پاس اگر علم یا معاملات کا ذخیرہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ درست فکر یا صحیح سوچ کا بھی حامل ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ علومِ قطعیہ (exact sciences) میں ریاضیات اور تجربات کے ذریعہ حتمیت

پیدا ہوسکتی ہے۔ مگر جہاں تک علوم ظنّی (especulative sciences) کا تعلق ہے، اُن میں اس قسم کی حتمیت ممکن نہیں۔ اس دوسری قسم کے علوم میں صحت فکر کے لیے سنجیدگی (sincerity) لازمی طور پر ضروری ہوتی ہے۔ تقویٰ آدمی کے اندر یہی سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ یہ سنجیدگی اس بات کی ضمانت بن جاتی ہے کہ آدمی کا علم اُس کو بھٹکنے سے بچالے۔

تقویٰ (خوف خدا) کبر وغرور کا قاتل ہے۔ تقویٰ آدمی کے اندر انانیت (egoism) کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ تقویٰ آدمی کو عُجب اور خود پسندی سے بچالیتا ہے۔ تقویٰ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ بے لاگ طور پر سوچے اور کسی آمیزش کے بغیر اپنی رائے قائم کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کو علم صحیح کا ذریعہ بتایا گیا۔

اجتماعی احتساب

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں بتایا گیا ہے کہ کسی معاشرہ کی صلاح وفلاح کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے۔ فرمایا — و لتكن منكم امة يدعون الى الخير و يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون -

''اور ضرور ہے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو نیکی کی طرف بلائے اور بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے''۔ (آل عمران ۱۰۴)

قرآن کی اس آیت میں معاشرہ کی فلاح کے لیے جس اہتمام کا تذکرہ کیا گیا ہے اُس کو اجتماعی احتساب کا نظام کہا جاسکتا ہے۔ یہ اجتماعی احتساب تمام تر ایک غیر سیاسی ادارہ ہے، اُس کا کوئی تعلق حکومت سے نہیں۔ حکومت قائم ہو یا قائم نہ ہو، ہر حال میں اجتماعی احتساب کا یہ کام غیر حکومتی اداروں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

ہر سماج میں ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے بعض افراد ایسے کام کرتے ہیں جس سے لوگوں کے اندر اشتعال پھیلے اور فساد کی نوبت آجائے۔ اس کے روک کی تدبیر یہ ہے کہ سماج کے اندر ایسے افراد اور ایسی تنظیمیں ہوں جو ہر ایسے موقع پر حرکت میں آجائیں۔ وہ بُرائی کرنے والوں کی مذمت کریں۔ وہ

سماج کو تیار کریں کہ وہ ایسے افراد کی براہِ راست یا بالواسطہ حمایت نہ کرے۔ وہ نصیحت اور تذکیر کے تمام ذرائع کو استعمال کر کے برائی میں ملوث ہونے والے افراد کی اصلاح کی مہم چلائیں۔ وہ ایسا ماحول پیدا کریں کہ بُرے افراد کے لیے سماج میں باعزت طور پر رہنا ناممکن ہو جائے۔

یہی اجتماعی احتساب کا نظام ہے۔ یہی نظام کسی سماج کی فلاح کا ضامن ہے۔ جس سماج میں ایسا ہو کہ سماج کے سربرآوردہ لوگ بُرے افراد کی مذمت نہ کریں، وہ ایسے افراد کی حوصلہ شکنی کے لیے کھڑے نہ ہوں، ایسا سماج یقینی طور پر فلاح سے محروم رہے گا۔

آیت میں فرمایا کہ: واولئك هم المفلحون (اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں)۔ یہ کوئی پُر اسرار بات نہیں۔ یہ دراصل فطرت کا ایک قانون ہے جس کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی فلاح کا بہت کم تعلق حکومت اور قانون سے ہے۔ اس کا زیادہ تعلق اُن تعمیری سرگرمیوں سے ہے جو غیر حکومتی سطح پر انجام دی جائیں۔ کسی سماج میں یہ ہونا چاہئے کہ اُس کے افراد دوسروں کے معاملہ میں غیر جانبدار بن کر نہ رہیں۔ وہ اپنی ذاتی فلاح کے ساتھ دوسروں کی فلاح بھی دل سے چاہتے ہوں۔ جس سماج کے افراد میں یہ اسپرٹ ہو وہاں یہ ہوگا کہ لوگ ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہیں گے۔ وہ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کا ساتھ دیں گے۔ وہ کسی دوسرے کو تکلیف میں دیکھیں گے تو وہ اُس پر تڑپ اُٹھیں گے اور اجتماعی زور کے ساتھ اُس کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ یہ چاہیں گے کہ سماج میں برائی دبے اور اچھائی پھیلے۔ اس قسم کا اصلاحی مزاج ہی کسی سماج کی تعمیر و ترقی کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ قرآن کی اس آیت میں دراصل اجتماعی ضمیر کی بات کہی گئی ہے، حکومت واقتدار سے اُس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

سازش بے اثر

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں بتایا گیا ہے کہ سازش کا سب سے زیادہ موثر توڑ کیا ہے۔ وہ ہے ـــ صبر اور تقویٰ۔ صبر اور تقویٰ بظاہر کوئی مادی طاقت نہیں، مگر صبر و تقویٰ کے ذریعہ سازش کا کامیاب دفاع کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

"اگر تم صبر کرو اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں خدا اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے"۔ (آل عمران ۱۲۰)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کے ایک قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں اصل مسئلہ سازش کی موجودگی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ سازش کے فطری توڑ کے لیے صبر اور تقویٰ موجود نہ ہو۔ موجودہ دنیا کو چیلنج اور مسابقت کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس لیے یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق سے آگے بڑھنے کے لیے سازش کرتا ہے لیکن اگر زیر سازش فریق کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت موجود ہو تو وہ اس کے لیے حفاظت کی گارنٹی بن جائے گا۔

صبر کا مطلب یہ ہے کہ جو کارروائی کی جائے وہ ردعمل کے تحت نہ کی جائے بلکہ مثبت غور وفکر کے ذریعہ ٹھنڈے ذہن کے تحت کی جائے۔ تقویٰ یعنی گاڈ کانشش نس اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی کسی بھی حال میں جسٹس سے نہ ہٹے، وہ جو کارروائی کرے وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر کرے۔ وہ خدا کے احکام کا پابند ہو، نہ کہ خود اپنی خواہشات وترغیبات کا پابند۔

سازش یا تشدد کے مقابلہ میں اگر جوابی سازش اور تشدد کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس سے فریقین کے درمیان ضد بڑھتی ہے۔ نفرت اور انتقام کی نفسیات جاگتی ہے۔ ایک دوسرے کے درمیان وہ منفی جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کو عام طور پر سبق سکھانا کہتے ہیں۔ اس طرح کے ماحول میں اصل مسئلہ مزید بڑھتا ہے۔ انتقام در انتقام کے نتیجہ میں وہ ایک ایسی برائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

اس کے برعکس صبر وتقویٰ کا طریقہ گویا منفی حالات کا جواب مثبت ردعمل سے دینا ہے۔ یہ تخریب کے جواب میں تعمیر کے اصول پر مسئلہ کو حل کرنا ہے۔ وہ دوطرفہ تشدد کو یک طرفہ بنا دیتا ہے۔ جب بھی کوئی فرد یا گروہ اس طرح صبر وتقویٰ کا طریقہ اختیار کرے تو وہ دو بات کو یقینی بنا لیتا ہے — فریقِ ثانی کے حق میں ناکامی اور اپنے حق میں کامیابی۔

حالات یکساں نہیں رہتے

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں ایک صورتِ حال پر تبصرہ ہے۔ پیغمبر اسلام کے ساتھیوں کو بدر کے

مقابلہ میں اپنے مخالفین پر فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُحد کے مقابلہ میں اُنہیں اپنے مخالفین سے شکست ہوگئی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

''اگر تم کو کوئی زخم پہنچا ہے تو دشمن کو بھی ویسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں''۔ (آل عمران ۱۴۰)

قرآن کی اس آیت میں قوموں کے بارہ میں ایک تاریخی قانون کو بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی قوم ہمیشہ غالب رہے یا ہمیشہ فتح حاصل کرتی رہے۔ اس بنا پر حالات ہمیشہ کسی ایک قوم کے موافق نہیں ہوتے۔ حالات کا فیصلہ کبھی ایک گروہ کے حق میں ہوتا ہے اور کبھی دوسرے گروہ کے حق میں۔ ایسی حالت میں لوگوں کو چاہئے کہ وہ تاریخ کے فیصلہ کو قبول کریں۔ وہ شکایت اور احتجاج کے بجائے ازسرِ نو اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کو مسابقت کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں کبھی ایک گروہ کو جیت حاصل ہوتی ہے اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ مقابلہ آرائی کا یہ ماحول قوموں کو مسلسل طور پر بیدار رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے ترقی کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔

ایسی حالت میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ ہارنے والے اور جیتنے والے دونوں اپنی ہار اور جیت کو وقتی سمجھیں۔ نہ ہارنے والا پست ہمت ہو اور نہ جیتنے والا فخر و ناز کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ اس معاملہ میں معتدل رویہ پر قائم رہنا گویا قدرت کے فیصلہ کو تسلیم کرنا ہے۔ اس کے برعکس معتدل رویہ سے ہٹنا گویا قدرت کے فیصلہ پر راضی نہ ہونا ہے۔ مگر جو لوگ اس معاملہ میں قدرت کے فیصلہ پر راضی نہ ہوں وہ خود اپنا ہی نقصان کریں گے، نہ کہ کسی اور کا۔

یہ معاملہ پوری طرح فطرت کے قانون کا معاملہ ہے۔ وہ کسی کے لیے اور کسی کی وجہ سے بدلنے والا نہیں۔ ایسی حالت میں کوئی فریق اگر اس کو قبول نہ کرے تو اُس کا یہ عدمِ قبول ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے پھول کے ساتھ کانٹا مطلوب نہیں یا کوئی شخص اس بات پر احتجاجی مہم چلائے

کہ دنیا کے نظام کو اس طرح بدل جانا چاہیے کہ یہاں صرف میرے لیے موافق موسم ہو، اور جو موسم میرے خلاف ہو وہ کبھی زمین پر نہ آئے۔

عالمی نظام کے بارہ میں اس قسم کی شکایت و احتجاج جتنی بے معنیٰ ہے اُتنا ہی بے معنیٰ وہ شکایت و احتجاج بھی ہے جو سیاسی تبدیلی یا قوموں کے عروج و زوال پر کی جائے۔

کائنات معرفت کا خزانہ ہے

قرآن میں سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ تدبّر اور تفکر ہے۔ قرآن کے مطابق، ہماری گرد و پیش کی دنیا حقائق کا خزانہ ہے۔ اُس میں غور و فکر کے ذریعہ آدمی زندگی کی حقیقتوں کو دریافت کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی کچھ آیتیں یہ ہیں:

''آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا''۔

(آل عمران ۱۹۱)

قرآن کی ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے اُس کو سائنس آف ٹروتھ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کائنات کے سائنسی مطالعہ کا مقصد صرف ٹیکنکل ترقی نہیں ہے اس سے بڑھ کر اُس کا ایک اور مقصد ہے، اور وہ ہے خالق کی تخلیقات میں خالق کو دریافت کرنا۔ تخلیقات کا گہرا مطالعہ کر کے زندگی کے راز کو معلوم کرنا۔ مادّی کائنات کی تحقیق کر کے یہ جاننا کہ اُس کے نقشہ کے مطابق، انسانی ترقی کا قانون کیا ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ کائنات میں کوئی خلل نہیں (الملک ۳) اس طرح کائنات کا مطالعہ انسان کے لیے اس میں مددگار ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تعمیر و تشکیل بھی کامیابی کے ساتھ انجام دے سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے اپنی زندگی میں جو نقشہ مطلوب ہے وہ وہی ہے جو بقیہ کائنات میں بالفعل قائم ہو۔ چنانچہ آدمی جب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اُس میں ایک طرف خالق کی تجلیات کو پالیتا ہے اور

دوسری طرف اُس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو اپنی زندگی کی کامیاب تعمیر کن خطوط پر کرنا چاہئے۔

خواہش کے خلاف

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ شوہر اور بیوی میں اگر اختلاف ہوجائے اور وہ ایک دوسرے کو ناپسند کرنے لگیں تو دونوں کو ٹکراؤ کے بجائے موافقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ:

''اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو'' (النساء ۱۹)

میاں اور بیوی کے تعلقات میں جب بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کے ناپسندیدہ پہلو کو مبالغہ آمیز انداز میں دیکھنے لگتا ہے۔ حالانکہ اُسی وقت اُس کے اندر کسی اور اعتبار سے پسندیدہ پہلو موجود ہوتا ہے۔ مگر غصہ کی وجہ سے دونوں پسندیدہ پہلو کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی آدمی صرف برا نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کی زندگی کا کوئی مثبت پہلو ہوتا ہے اور کوئی منفی پہلو۔ اگر منفی پہلو کو نظر انداز کر کے معاملہ کیا جائے تو اس کے زبردست فائدے دونوں فریق کو حاصل ہوں گے۔

ازدواجی زندگی میں جب ایک مرد اور عورت دونوں اپنے آپ کو شامل کرتے ہیں تو یہ دونوں کے لیے سب سے زیادہ قریبی تعلق کے ہم معنٰی ہوتا ہے۔ اس قسم کا قریبی تعلق بے حد مفید ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس قسم کے قریبی تعلق میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان فرق کی بنا پر اختلافات پیدا ہو جائیں اور پھر کسی ایک فرق کی بنا پر دونوں ایک دوسرے کو مطلوب سے کم سمجھنے لگیں۔ مگر یہ سرتاسر نادانی ہے۔ عقلمندی یہ ہے کہ قریبی تعلق کے تعمیری پہلوؤں کو دھیان میں رکھا جائے اور اُن سے بھرپور طور پر فائدہ اُٹھایا جائے۔ جہاں تک ناپسندیدہ پہلوؤں کی بات ہے تو اس معاملہ میں حقیقت پسندانہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے اُس کو نظر انداز کر دینا چاہئے، یہی مرد کو بھی کرنا ہے اور یہی عورت کو بھی۔

دوررس کلام

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں کامیاب کلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ پیغمبر سے خطاب کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جولوگ بظاہر انکار کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں اُن کو کس طرح اقرار کی روش پر لایا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

''پس تم ان سے اعراض کرو اور اُن کو نصیحت کرو اور اُن سے ایسی بات کہو جو اُن کے دلوں تک پہنچنے والی ہو''۔(النساء ۶۳)

جب کوئی شخص کسی بات کو ماننے سے انکار کرتا ہے تو اُس کا یہ انکار سادہ طور پر محض انکار نہیں ہوتا بلکہ اُس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اپنے ذہنی ڈھانچہ کی بنا پر وہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ لمبی مدت تک ایک خاص فکری ماحول میں رہنے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ چیزوں کو ایک خاص زاویہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس لیے وہ چیزوں کو کسی اور زاویہ سے دیکھ نہیں پاتا۔ اکثر حالات میں کسی انسان کا انکار اُس کی فکری مجبوری کی بنا پر ہوتا ہے، نہ کہ دانستہ سرکشی کی بنا پر۔

ایسی حالت میں ضرورت ہوتی ہے کہ صبر آزما کوشش کے ذریعہ اُس کے اندر نئی سوچ لائی جائے۔ اُس کے ذہن کے اوپر پڑے ہوئے پردوں کو ہٹا دیا جائے۔ مصلح کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی منفی روش کو نظر انداز کرتے ہوئے خیر خواہانہ طور پر اُن کو سمجھانے بجھانے کا طریقہ جاری رکھے۔ وہ اُن کے ذہن پر پڑے ہوئے پردوں کو اس طرح ہٹائے کہ سچائی کی بات کسی رکاوٹ کے بغیر اُس کے ذہن تک پہنچ جائے۔ جب ایسا ہوگا تو اُس کے لیے سچائی کا اعتراف اُسی طرح آسان بن جائے گا جس طرح کسی باپ کے لیے اپنے بیٹے کو پہچاننا آسان ہوتا ہے۔

ٹائم مینجمنٹ

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں نماز کا حکم بتایا گیا ہے جو اسلام میں اہم ترین عبادت ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرر وقتوں میں''(النساء ۱۰۳)

نماز اسلام کی ایک بنیادی عبادت ہے۔ اُس کا ادا کرنا ہر مسلمان پر ہر روز کے لیے فرض ہے۔ وہ رات اور دن کے درمیان پانچ بار مقرر اوقات پر ادا کی جاتی ہے۔ جس طرح نماز کی ادائگی ضروری ہے اُسی طرح اُس کے اوقات کی پابندی بھی ضروری ہے۔

نماز اصلاً ایک عبادت ہے۔ مگر اُس کی ادائگی میں اوقات کی پابندی کو شامل کر دیا گیا ہے۔ اس طرح نماز گویا وقت کی پابندی کا ایک سبق ہے جو ہر دن لازمی طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ نماز عبادت کے ساتھ ٹائم مینجمنٹ (time management) کی ایک لازمی تربیت ہے۔ اس طرح نمازی کے رات اور دن کو پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے— (۱) فجر سے لے کر ظہر تک (۲) ظہر سے لے کر عصر تک (۳) عصر سے لے کر مغرب تک (۴) مغرب سے لے کر عشاء تک (۵) عشاء سے لے کر فجر تک۔

انسان کے پاس سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ وقت کے صحیح استعمال کا انجام کامیابی ہے اور وقت کے غلط استعمال کا انجام ناکامی ہے۔ نماز کی صورت میں ٹائم مینجمنٹ کا سبق جو ہر روز دیا جاتا ہے وہ اس دنیا میں کامیاب زندگی کو یقینی بناتا ہے۔ آدمی اگر اپنے رات اور دن کے اوقات کو اس طرح پانچ خانوں میں تقسیم کر لے اور روزانہ اُس کی پابندی کرے تو وہ اپنی پوری زندگی کو بھر پور طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ اور اس دنیا میں جو آدمی اپنے ملے ہوئے اوقات کو منظم طور پر اور بھر پور طور پر استعمال کرے اُس کو کوئی بھی چیز اعلیٰ کامیابی تک پہنچنے سے روکنے والی نہیں۔

ٹائم مینجمنٹ کا مطلب، دوسرے لفظوں میں لائف مینجمنٹ ہے۔ زندگی کو درست طور پر کیسے گذارا جائے، اس کا بہت گہرا تعلق اس سے ہے کہ آدمی اپنے اوقات کو کس طرح استعمال کرے۔ جس آدمی کے اندر وقت کے درست استعمال کا مزاج پیدا ہو جائے وہ اسی کے ساتھ دوسری بہت سی برائیوں سے بچ جائے گا۔ وقت کا صحیح استعمال آدمی کو اس قابل بنائے گا کہ وہ اپنے حاصل شدہ ذرائع کو درست طور پر استعمال کرے۔

مثلاً ٹائم مینجمنٹ کا مزاج آدمی کو سادہ زندگی پر مجبور کر دیتا ہے۔ کیوں کہ سادہ زندگی اختیار نہ

کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک معاملہ میں ضرورت سے زیادہ توجہ دینا، دوسرے معاملہ میں کمی کے ہم معنٰی بن جاتا ہے۔ اسی طرح تفریح کا مزاج آدمی کو یہ نقصان پہنچاتا ہے کہ اُس کے پاس دوسرے زیادہ ضروری کاموں کے لیے وقت ہی نہ رہے۔ اسی طرح لذیذ کھانوں کا شوق آدمی کے لیے اس نقصان کا سبب بنتا ہے کہ وہ زندگی کے دوسرے ضروری پہلوؤں کے بارہ میں غافل ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹائم مینجمنٹ اپنے اوقات کی درست تقسیم کا دوسرا نام ہے۔ جب آدمی کے اندر صحیح معنوں میں ٹائم مینجمنٹ کا احساس پیدا ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بہت سی غیر ضروری یا غیر اہم چیزوں سے بچ جائے گا۔ مثلاً فضول خرچی، مصنوعی تکلفات، غیر حقیقی مشاغل، وقتی تفریحات، وغیرہ۔

زندگی میں ساری کی بے حد اہمیت ہے۔ سادگی با مقصد انسان کا کلچر ہے۔ تاہم سادگی کے اصول پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے جو ٹائم مینجمنٹ کی اہمیت کو سمجھ لے، وہ اپنے اوقات کے بارہ میں پوری طرح حساس ہو جائے۔ ایسا آدمی جب بھی سادگی کے خلاف کوئی کام کرے گا تو اُس کی یہ حساسیت اُس کو فوراً روک دے گی۔ وہ محسوس کرے گا کہ وہ سادگی کے خلاف طریقہ استعمال کر کے اپنے آپ کو اس ہلاکت میں ڈال رہا ہے کہ اُس کے پاس زیادہ اہم کاموں کے لیے نہ پیسہ رہے اور نہ وقت۔

صُلح بہتر ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں شوہر اور بیوی کے درمیان نزاع کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس مسئلہ کا حل کس طرح تلاش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے:

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رُخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں صُلح کرلیں اور صُلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کرو گے اللہ اُس سے باخبر ہے۔ (النساء ۱۲۸)

قرآن کی اس آیت میں صُلح کو بہتر بتایا گیا ہے۔ یہ بات بظاہر خاندانی نزاع کے بارہ میں ہے

مگر اُس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔ صُلح ایک اعلیٰ تدبیر ہے جو ہر نزاعی مسئلہ کا واحد کامیاب حل ہے، خواہ وہ نزاعی مسئلہ انفرادی ہو یا اجتماعی، خواہ وہ قومی ہو یا بین اقوامی۔

جب بھی دو آدمیوں یا دو فریقوں کے درمیان کوئی نزاع پیش آتی ہے تو اس نزاع کو حل تک نہ پہنچنے کا سبب صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ حرص ہے۔ اس موقع کے لحاظ سے حرص کا مطلب یہ ہے کہ عملاً جو کچھ مل رہا ہے اُس پر راضی نہ ہونا اور اُس سے زیادہ چاہنا۔ یہی حرص یا زیادہ چاہنے کا مزاج نزاع کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ وہ آخر کار بڑھ کر باقاعدہ ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں صُلح یہ ہے کہ بروقت جو کچھ عملی طور پر مل رہا ہے اُس پر راضی ہو کر معاملہ کو ختم کر دینا۔ جب ایک شخص صُلح کے اس طریقہ کو اختیار کرے تو اپنے آپ نزاع کی حالت ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد یہ نوبت ہی نہیں آتی کہ نزاع بڑھ کر ٹکراؤ بن جائے۔ نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو حرص کا طریقہ ہمیشہ مزید نقصان کا سبب بنتا ہے، اور صُلح کا طریقہ کام کے مواقع کھولتا ہے جس کو استعمال کرکے مزید ترقی حاصل کر لی جائے۔

صُلح کوئی سادہ بات نہیں۔ صُلح کوئی انفعالی روش نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صُلح اپنے آپ میں سب سے بڑا عمل ہے۔ صُلح بظاہر میدانِ مقابلہ سے واپسی ہے۔ مگر عملاً وہ اقدام کی سب سے بڑی تدبیر ہے۔ جب کوئی فرد یا گروہ صُلح کرلے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے لیے ایک ایسا ماحول پالیا جس کے اندر وہ ٹکراؤ میں وقت ضائع کیے بغیر اپنے پورے وقت اور طاقت کو اپنے تعمیری منصوبہ میں لگائے۔

غیر مصالحانہ طریقہ زندگی کے سفر کو روک دیتا ہے۔ اس کے برعکس مصالحانہ طریقہ زندگی کے سفر کو رُکے بغیر دوبارہ مزید اضافہ کے ساتھ جاری کر دیتا ہے۔

انتہا پسندی نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں جو احکام دیے گئے ہیں اُن میں سے ایک حکم یہ ہے کہ لوگ غلو یا انتہا پسندی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ غلو یا انتہا پسندی ہر حال میں بُری چیز ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اے اہل کتاب، تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے بارہ میں تم کوئی بات حق کے سوا نہ کہو (النساء ۱۷۱)

اس آیت میں جس روش کو غلو کہا گیا ہے وہ وہی ہے جس کو انتہا پسندی (extremism) کہا جاتا ہے۔ انتہا پسندی بظاہر اچھی نیت کے ساتھ ہوتی ہے۔ اُس کے پیچھے یہ جذبہ ہوتا ہے کہ کسی مقصد کو مزید قوت کے ساتھ حاصل کیا جائے۔ انتہا پسندی دراصل اعتدال پسندی کی ضد ہے۔

انتہا پسندی کی روش بظاہر اچھی نیت کے ساتھ کی جاتی ہے مگر عملی نتیجہ کے اعتبار سے وہ سخت نقصان دہ ہے۔ اس دنیا میں کوئی صحیح یا مثبت نتیجہ ہمیشہ اعتدال کی روش کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ انتہا پسندی کی روش صرف نقصان پہنچاتی ہے وہ کسی فائدہ کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کام خارجی اسباب کی رعایت کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ خارجی اسباب کا لحاظ نہ کرتے ہوئے جو اقدام کیا جائے گا وہ صرف تباہی کا سبب بنے گا۔

انتہا پسندی اور اعتدال پسندی میں یہی فرق ہے۔ انتہا پسند لوگ صرف اپنی خواہش کو جانتے ہیں وہ خارجی اسباب سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اعتدال پسند آدمی اپنی خواہش کے ساتھ خارجی اسباب کو بھی اپنے دھیان میں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہا پسند آدمی ہمیشہ ناکام ہوتا ہے اور اعتدال پسند آدمی ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔

غلو یا انتہا پسندی ایک ایسی روش ہے جو فطرت کے قوانین کے خلاف ہے۔ کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فطرت ہمیشہ اعتدال اور تدریج کے اصول پر کام کرتی ہے۔ یہ اُصول جو خارجی دنیا میں عملاً قائم ہے وہی اُصول انسان کے لیے بھی مفید ہے۔ فطرت کا نظام عمل کی زبان سے انسان کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ تم اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہتے ہو تو غلو کو چھوڑ دو اور اعتدال کا طریقہ اختیار کرو۔

سچائی کی دریافت

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ایک واقعہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: اور جب وہ اس کلام کو سنتے

ہیں جو رسول پر اُتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ اُن کو حق کا عرفان حاصل ہو گیا (المائدہ ۸۳)۔ ایک اور موقع پر اسی قسم کی بات اس طرح کہی گئی ہے:

ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل دہل جائیں اور جب اللہ کی آیتیں اُن کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ اُن کا ایمان بڑھا دیتی ہیں (الانفال ۲)

ان آیتوں سے ایک اہم حقیقت واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ سچائی سب سے بڑی طاقت ہے۔ کوئی انسان جب سچائی کو دریافت کرتا ہے تو اُس کی پوری شخصیت ہل جاتی ہے۔ اُس کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ روحانیت کے سمندر میں نہا اُٹھتا ہے۔ اُس کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے جو اُس کی اندرونی شخصیت کو آخری حد تک منور کر دیتی ہے۔ سچائی کی دریافت کسی انسان کے لیے سب سے بڑا تجربہ ہے، اس سے زیادہ بڑا تجربہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جس آدمی کے پاس سچائی ہو وہ سب سے زیادہ طاقتور انسان ہے۔ وہ ایک تسخیری طاقت کا مالک ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں کو جیت سکتا ہے۔ وہ ہتھیار کے بغیر فاتح بن سکتا ہے۔ بظاہر کوئی مادی طاقت نہ رکھتے ہوئے بھی وہ سب سے بڑی طاقت کا مالک ہے۔ سچائی پانے والے کے لیے سچائی ایک انقلاب ہے۔ اور سچائی رکھنے والے کے لیے سچائی ایک طاقت کا خزانہ ہے۔

کسی شخص کی زندگی میں جو چیز سب سے زیادہ ہلچل پیدا کرنے والی ہے وہ سچائی کی دریافت ہے۔ کسی آدمی کا یہ احساس کہ میں نے سچائی کو اُس کی بے آمیز صورت میں دریافت کر لیا ہے، اُس کے اندر فکر و خیال کا طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اس قسم کا واقعہ کسی آدمی کے پورے اندرونی وجود کو متحرک کر دیتا ہے۔ وہ اُس کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے۔

خدا کا کلام صرف یہ نہیں کرتا کہ وہ انسان کو کچھ باتوں کی خبر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگاتا ہے۔ وہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود چراغ کو روشن کر دیتا ہے۔ وہ انسان کے داخلی شعور کو خارجی حقیقت سے جوڑ دیتا ہے۔

انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر معرفت کا احساس رکھ دیا گیا ہے۔ مگر اس خفتہ احساس کو متحرک (activate) کرنے کے لیے خارجی مدد کی ضرورت ہے۔ خدا کا کلام یہی خارجی روحانی مدد فراہم کرتا ہے۔ خدا کے کلام سے رہنمائی پانے کے بعد انسان کا حال یہ ہوتا ہے جیسے اندھیرا گھر روشن ہوجائے یا سوکھا ہوا باغ لہلہا اُٹھے۔

زمین میں فساد نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق رہے، وہ اس سے انحراف نہ کرے۔ مذکورہ قرآنی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

پس ناپ اور تول پوری کرو۔ اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں۔ اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد (الاعراف ۸۵)

خدا نے اس زمین کو ایک اصلاح یافتہ زمین کے طور پر پیدا کیا ہے۔ یہاں ہر چیز اپنی معیاری صورت میں ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے سوا جو دنیا ہے وہاں عدل اور پوری ادائیگی کا اصول قائم ہے۔ یہ گویا ایک اصلاحی نظام ہے جو خدا کی زمین پر قانونِ فطرت کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ انسان کو بھی اپنی زندگی میں اسی اصلاحی اصول کو اختیار کرنا ہے۔ اس کے خلاف چلنا گویا زمین میں فساد برپا کرنا ہے۔ بناؤ میں بگاڑ کو داخل کرنا ہے۔

اس معاملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ زمین میں ہر چیز کو نہایت متناسب انداز (right proportion) میں رکھا گیا ہے۔ سورج کی روشنی، بارش اور ہوا ہر چیز میں ایک خاص تناسب قائم ہے۔ زمین کی سطح پر سبزہ اور جنگلات سوچے سمجھے اندازہ کے مطابق اُگائے گئے ہیں۔ انسان کے لیے بقا اور ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ فطرت کے اس اصلاحی نقشہ کو برقرار رکھے۔

زمین کے اندر فطرت کا جو نظام ہے وہ گویا ایک ماڈل ہے۔ انسان کو بھی اسی ماڈل پر اپنی زندگی کی تشکیل کرنی ہے۔ انسان اگر ایسا کرے کہ وہ فطرت کے اس ماڈل کو اپنی زندگی میں اختیار نہ کرے، اسی کے ساتھ وہ مزید یہ سرکشی کرے کہ وہ فطرت کے نظام کو بدل دے، مثلاً ہوا میں گیسوں کے فطری

تناسب کو بگاڑ دے تو گویا وہ دوہرا جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ خدا کے غضب کا شکار ہو کر رہ جائیں گے، وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔

اعراض کا طریقہ

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں چند اخلاقی نصیحتیں کی گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک نصیحت یہ ہے کہ باہمی معاملات میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ قرآن کی مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

درگزر کرو، نیکی کا حکم دو اور نادانوں سے اعراض کرو (الاعراف ۱۹۹)

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اور دوسرے شخص کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے درمیان بحث اور تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر درست طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر فریقِ ثانی سنجیدہ ہو، وہ مسئلہ کو حقیقی طور پر سمجھنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں دلیل کے ذریعہ اُس کے سامنے اپنا موقف رکھنا چاہئے۔ اور اگر وہ سنجیدہ نہ ہو تو ایسی حالت میں دلیل اور منطق اُس کو متاثر نہ کر سکے گی۔ وہ ہر دلیل کے جواب میں کچھ خود ساختہ الفاظ بول دے گا اور پھر یہ سمجھے گا کہ اُس نے پیش کردہ دلیل کو رد کر دیا ہے۔

اس دوسری صورت میں درست طریقہ یہ ہے کہ اعراض (avoidance) کے اصول پر عمل کیا جائے۔ اعراض کا مقصد دراصل یہ ہے کہ آدمی کو اُس کے ضمیر کے حوالہ کر دیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ جو مقصد دلیل کے ذریعہ پورا نہیں ہوا وہ ضمیر کی خاموش آواز کے ذریعہ پورا ہو جائے۔

عملی نزاع کو ختم کرنے کے لیے بھی سب سے زیادہ موثر ذریعہ اعراض ہے۔ عملی نزاع کے وقت اگر اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے تو نزاع اپنے پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جائے گی۔ جب کہ اعراض نہ کرنے کا نقصان یہ ہے کہ نزاع بڑھتی رہے، یہاں تک کہ چھوٹی برائی (lesser evil) کی جگہ بڑی برائی (greater evil) کا سامنا کرنا پڑے۔

اعراض کوئی سادہ چیز نہیں، وہ ایک اعلیٰ اخلاقی روش ہے۔ وہ ایک اعلیٰ انسانی طریقہ ہے۔ کوئی شخص جب اشتعال کی صورت پیش آنے پر بھڑک اُٹھے تو وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک پست انسان

ہے۔اس کے برعکس جو آدمی اشتعال کی صورت پیش آنے پر نہ بھڑکے وہ ایسا کرکے یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ بلند انسانی مرتبہ پر ہے، وہ صحیح معنوں میں اعلیٰ انسان کہے جانے کا مستحق ہے۔

یقین واعتماد

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔پیغمبر اسلام مکہ میں پیدا ہوئے۔ وہاں اُن کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس کے بعد وہ ۶۲۲ء میں مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ یہ ایک بے حد خطرناک سفر تھا۔ دو ہفتہ کے اس سفر کے دوران ایک بار وہ ایک غار (ثور) میں چھپے ہوئے تھے۔آپ کے مخالفین جو آپ کی تلاش میں نکلے تھے، وہ تلوار لیے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ گئے۔اُس وقت آپ کے واحد ساتھی ابوبکر صدیق تھے۔اُنھوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا کہ اے خدا کے رسول، وہ تو یہاں بھی پہنچ گئے۔اس کے بعد قرآن کا بیان یہ ہے—**اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا:**

جب پیغمبر اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے (التوبہ ۴۰)

موجودہ زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھنے لگتا ہے۔اس حالت میں اُس کو ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی ذات ہو جس پر وہ یقین کر سکے۔ جو اُس کے عجز کی تلافی بن جائے۔

خدا کی ذات پر یقین آدمی کو یہی اتھاہ سہارا دیتا ہے۔خدا تمام طاقتوں کا مالک ہے۔اس لیے خدا پر یقین آدمی کو ایک ایسی ہمت دیتا ہے جو کبھی نہ ٹوٹے۔خدا کا عقیدہ کسی آدمی کے لیے حوصلہ کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔جس آدمی کو خدا کی ذات پر پورا یقین ہو جائے وہ کسی بھی حال میں بے حوصلہ نہیں ہوگا۔وہ کسی بھی حال میں اس احساس سے دوچار نہیں ہوگا کہ اُس کا راستہ بند ہے۔وہ ہر حال میں آگے بڑھتا چلا جائے گا۔زندگی کی آخری منزل تک پہنچنے میں کوئی بھی چیز اُس کے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔

خدا کا یہ عقیدہ انسان کی اپنی صلاحیتوں کو جگا دیتا ہے۔وہ انسان کے اندر ایک نیا عزم پیدا کر دیتا ہے۔وہ اس کی داخلی قوتوں کو متحرک کر کے ایک بے حوصلہ انسان کو باحوصلہ انسان بنا دیتا ہے۔

برائی اور بھلائی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۱ میں زندگی کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ اس قانون کا تعلق ہر فرد سے ہے، مرد سے بھی اور عورت سے بھی۔ عام انسان سے بھی اور خاص انسان سے بھی۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

> بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والوں کے لیے۔ (ھود ۱۱۴)

انسان پتھر نہیں ہے۔ انسان سے مختلف قسم کی غلطیاں پیش آتی ہیں۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرد یا ایک عورت سے ایک واقعہ سرزد ہو گیا۔ بعد کو اُنہیں احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس غلطی کی تلافی کس طرح کی جائے۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں غلطی کی تلافی کے اسی اُصول کو بتایا گیا ہے۔

آدمی جب کوئی غلطی کرتا ہے تو اُس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کے دل کے اندر اچھے اور برے کے بارہ میں حسّاسیت (sensitivity) کم ہو جاتی ہے۔ اور اگر آدمی بار بار وہی برائی کرتا رہے تو اُس کی حسّاسیت پوری طرح ختم ہو جائے گی۔ جب کہ یہی حسّاسیت بُرائی کے خلاف سب سے بڑا چک ہے۔ ایسی حالت میں حساسیت کا ختم ہونا انسان کا گویا حیوان بن جانا ہے۔ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ آدمی برائی کرنے کے بعد بھلائی کرے — وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرے۔ وہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ وہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ جو آدمی ایسا کرے وہ اپنے دل کو دوبارہ پاک کرلے گا۔ اُس کے دل کی حسّاسیت دوبارہ اُس کی طرف لوٹ آئے گی۔

بُرائی کا دوسرا اثر وہ ہے جس کا تعلق سماج سے ہے۔ سماج کے ایک فرد کا برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے پُرسکون پانی میں پتھر پھینکنا۔ چنانچہ ایک فرد کا برائی کرنا پورے سماج کو متاثر کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اپنی برائی کی تلافی کرنا گویا پورے سماج کو بگاڑ سے بچانا ہے۔ یہ فرد کے اوپر ایک سماجی فرض ہے کہ وہ اپنی برائی کے انجام سے سماج کو بچائے۔

نفس امّارہ، نفس لوّامہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ہر انسان کے اندر دو مختلف قسم کی صلاحیتیں (faculties) ہیں۔ ایک نفس امّارہ (یوسف ۵۳) اور دوسرے نفس لوّامہ (القیامہ ۲) انسان کے اکثر اعمال انہی دونوں صلاحیتوں کے تحت انجام پاتے ہیں، خواہ وہ فرد سے تعلق رکھتا ہو یا جماعت سے۔

قرآن کی اس آیت میں نفس امّارہ سے مراد برائی کا حکم دینے والا نفس ہے۔ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو انانیت (ego) کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں نفس لوّامہ سے مراد ملامت کرنے والا نفس ہے۔ اس سے مراد وہی چیز ہے جس کو ضمیر (conscience) کہا جاتا ہے۔

اجتماعی زندگی کا اصول یہ ہے کہ جب دو آدمیوں یا دو پارٹیوں کے درمیان کوئی مسئلہ پیش آئے تو اس وقت سارا فیصلہ اس پر منحصر ہوتا ہے کہ آدمی کے ایگو (ego) کو جگایا گیا ہے یا اس کے ضمیر کو جگایا گیا ہے۔ اگر آپ آدمی کے ایگو کو جگائیں تو اس کا نتیجہ بگاڑ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

When one's ego is touched it turns into
super ego and the result is breakdown.

اس کے برعکس اگر آدمی کے ضمیر کو ٹچ (touch) کیا جائے تو اس کے اندر اعتراف اور شرمندگی کا جذبہ جاگ جائے گا اور فیصلہ انصاف کے مطابق ظاہر ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی آپ کا معاملہ کسی شخص سے پیش آئے یا اُس کے ساتھ کوئی نزاع قائم ہو جائے تو اُس وقت گویا نتیجہ مکمل طور پر خود آپ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنی کسی اشتعال انگیز کارروائی سے فریقِ ثانی کے ایگو (نفس امّارہ) کو بھڑکا دیں تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فریقِ ثانی آپ کے لیے مخالف کے روپ میں اُبھرے گا۔ وہ آپ کی اشتعال انگیزی کا جواب نفرت اور تشدد کی صورت میں دے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ اختلاف ونزاع کے موقع پر صبر واعراض کا طریقہ اختیار کریں تو ایسی صورت میں فریقِ ثانی کی طرف سے آپ کو بالکل مختلف قسم کا تجربہ پیش آئے گا۔ اب ایسا ہوگا کہ بظاہر جو آدمی آپ کا حریف بنا ہوا تھا وہ آپ کے لیے ایک بے ضرر انسان بن جائے

گا۔اس کے بعد آپ اور فریقِ ثانی کے درمیان ایسی معتدل فضا قائم ہو جائے گی جس میں آپ کوئی نیا مسئلہ پیدا کیے بغیر اپنے آپ کو حل کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں دشمن اور دوست دونوں خود آپ کی پیداوار ہیں۔آپ کا خود اپنا رویہ کسی کو اپنا دشمن بنا دیتا ہے۔اسی طرح خود آپ کا دوسرا رویہ اُس کو آپ کا دوست بنا دیتا ہے۔اب یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ آپ فریقِ ثانی کو اپنا دشمن بناتے ہیں یا اپنا دوست۔

انتظار کی پالیسی

قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں ایک پیغمبر کا واقعہ بیان ہوا ہے۔اُن کے اوپر بہت سے سخت حالات پیش آئے۔مگر وہ تقویٰ اور صبر پر قائم رہے۔یہاں تک کہ خدا نے اُن کو سرفرازی عطا فرمائی۔اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

جو شخص ڈرے اور صبر کرے تو اللہ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (یوسف ۹۰)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔وہ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شام کے بعد صبح آتی ہے۔ایسا ہونا لازمی ہے۔آدمی کو چاہئے کہ جب اُس پر اندھیری رات آئے تو گھبرا نہ اُٹھے بلکہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔اگر وہ ایسا کرے تو جلد ہی وہ دیکھے گا کہ اُس کے اوپر سورج طلوع ہوا اور ہر طرف اُجالا پھیل گیا۔

تقویٰ یہ ہے کہ آدمی خدا کے مقرر کیے ہوئے نظام پر راضی رہے۔اور صبر کا مطلب یہ ہے کہ وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راستہ ہے۔اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں جس پر چل کر آدمی اپنی منزل پر پہنچ سکتا ہو۔

قانونِ فطرت کے مطابق، اس دنیا میں کوئی ناکامی ابدی ناکامی نہیں۔ ہر ناکام حال کے ساتھ ایک کامیاب مستقبل جڑا ہوا ہے۔انسان کو چاہئے کہ وہ بے صبری کر کے اس نظام کو نہ بگاڑے۔وہ صبر کی پالیسی اختیار کر کے قدرت کے اگلے فیصلہ کا انتظار کرتا رہے۔موجودہ دنیا میں انسان کے لیے یہی پالیسی مفید بھی ہے اور یہی پالیسی ممکن بھی۔

فطرت کے اسی اُصول کو ایک مشہور مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ــــ انتظار کرو اور دیکھو (wait and see)۔ یہ ایک عالمی تجربہ ہے جو اس مقولہ کی صورت میں ڈھل گیا ہے۔ اس معاملہ میں یہی مذہبی تعلیم بھی ہے اور یہی فطرت کا تقاضا بھی۔

قوموں کا عروج وزوال

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں بتایا گیا ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کا قانون کیا ہے۔ یہ فطرت کے ایک اُصول پر مبنی ہے جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ــــ **ان الله لا یغیر مابقوم حتی یغیروا ما بانفسهم:**

بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اُس کو نہ بدل ڈالیں جو اُن کے جی میں ہے (الرعد ۱۱)

قرآن کی اس آیت میں **ما بقوم** سے مراد کسی قوم کی اجتماعی حالت ہے اور **مابأنفس** سے مراد کسی قوم کی انفرادی حالت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی ترقی کا راز یہ ہے کہ اُس کے افراد کے اندر انسانی صفات (human qualities) اعلیٰ درجہ میں موجود ہوں۔ اس کے برعکس کسی قوم کا اجتماعی زوال اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اُس کے افراد کے اندر اعلیٰ انسانی صفات باقی نہ رہیں۔ فرد کی حالت ہی پر ترقی کا انحصار بھی ہے اور تنزل کا انحصار بھی۔

فطرت کا یہ قانون بتاتا ہے کہ کوئی قوم اگر گراوٹ کا شکار ہو جائے تو اُس کو دوبارہ اُٹھانے کا عمل کہاں سے شروع کرنا چاہئے۔ اس کا واحد کارگر طریقہ یہ ہے کہ افراد کے اندر پھر سے شعوری بیداری لائی جائے۔ افراد کے سیرت وکردار کو بُلند کیا جائے۔ افراد کے اندر اتحاد اور انسانیت کی روح کو جگایا جائے۔

قومی اصلاح کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے برعکس اگر قومی اصلاح کے نام پر عمومی تحریک (mass movement) چلائی جائے، جلسوں اور عوامی تقریروں کے ذریعہ بھیڑ کو مخاطب کیا جائے تو ایسے عمل کا کوئی مطلوب نتیجہ ہرگز نکلنے والا نہیں۔ اس قانون کے مطابق، کسی قوم کی خارجی حالت ہمیشہ

اس کی داخلی حالت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ایسی حالت میں کسی قوم کے زوال کے وقت اُس کی اصلاح کا آغاز داخلی محنت سے ہوگا، نہ کہ خارجی کارروائیوں سے۔

استحکام کا راز

قرآن کی سورہ نمبر ۱۳ میں اس قانون فطرت کو بتایا گیا ہے جس کے تحت اس دنیا میں کسی کو قیام اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔یہ نفع بخشی (giving spirit) ہے۔اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھالیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں۔اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے (الرعد ۱۷)

اس آیت میں فطرت کی دو مثالوں کے ذریعہ ایک حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔وہ حقیقت یہ ہے کہ سماجی اور قومی زندگی میں ایک کے مقابلہ میں دوسرے کے لیے قیام اور استحکام کا راز کیا ہے۔وہ راز صرف ایک ہے اور وہ نفع بخشی ہے۔اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ جو گروہ دینے والا گروہ (giver group) ہو اس کو دوسروں کے مقابلہ میں جماؤ اور ترقی حاصل ہو اور جو گروہ لینے والا گروہ (taker group) بن جائے وہ دوسروں کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر رہ جائے۔

اس قانون کی روشنی میں دیکھا جائے تو محرومی کے وقت مطالبہ کی مہم سراسر بے معنیٰ ہے۔کیوں کہ اس دنیا میں کسی کو مطالبہ سے کچھ نہیں مل سکتا۔اس دنیا میں جب بھی کسی کو کچھ ملے گا تو وہ صرف دینے کی قیمت پر ملے گا۔اس معاملہ میں موجودہ دنیا کا قانون ایک لفظ میں یہ ہے— جتنا دینا اُتنا پانا۔

شکر سے اضافہ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۴ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔وہ یہ کہ خدا کے بنائے ہوئے

قانون کے مطابق، اس دنیا میں شکر کرنے سے اضافہ ہوتا ہے۔ یہ قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

اور جب تمہارے رب نے تم کو آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ دوں گا۔ اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے (ابراہیم ۷)

قرآن کی اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ وہ معلوم اسباب کے تحت پیش آنے والا ایک واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ہر ایک کے ساتھ پیش آتا ہے، فرد کے لیے فرد کی حیثیت سے اور گروہ کے لیے گروہ کی حیثیت سے۔

شکر دراصل اعتراف (acknowledgement) کا نام ہے۔ انسان کی نسبت سے جس چیز کو اعتراف کہا جاتا ہے اُسی کو خدا کی نسبت سے شکر کہا گیا ہے۔ شکر یہ ہے کہ خدا نے آدمی کو جو کچھ دیا ہے، دل کی گہرائیوں کے ساتھ وہ اس کا اعتراف کرے۔

یہ شکر یا اعتراف کوئی سادہ چیز نہیں۔ اُس کا رشتہ نہایت گہرائی کے ساتھ آدمی کی نفسیات سے جُڑا ہوا ہے۔ شکر کرنے والے آدمی کے اندر تواضع، حقیقت پسندی، اعترافِ حق، سنجیدگی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساسات اُس کے کردار میں نمایاں ہوتے ہیں جو اُس کو ترقی کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس معاملہ ناشکری کا ہے۔ ناشکری سے آدمی کے اندر سرکشی، حقیقت سے اعراض، بے اعترافی، غیر سنجیدگی اور غیر ذمہ داری جیسی پست صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کی پست صفات پائی جائیں اُس کی ترقی یقینی طور پر رُک جائے گی۔ حتیٰ کہ ممکن ہے کہ وہ ملے ہوئے کو بھی کھو دے۔

سبق لینے والے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۵ میں بعض تاریخی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ واقعات قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو بتاتے ہیں۔ ان تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

بے شک اس میں نشانیاں ہیں متوسمین کے لیے (الحجر ۷۵)

عربی زبان میں وسم کے معنٰی علامت کے ہوتے ہیں۔توسُّم کے معنٰی ہیں، کسی چیز کو علامت سے پہچاننا۔مثلاً آپ کسی کو دیکھ کر کہیں :توسّمت فيه الخير یا توسّمت فيه الشر ۔یعنی اُس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ اُس کے اندر خیر کا مادہ ہے یا یہ کہ اُس کے اندر شر کا مادہ ہے۔جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت ہو اُس کو متوسّم کہا جاتا ہے۔

یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی آدمی کو صاحب بصیرت بناتی ہے۔جن لوگوں کے اندر یہ صلاحیت ہو وہ ہر مشاہدہ اور ہر تجربہ سے سبق لیتے رہیں گے۔وہ سطور میں بین السطور کو پڑھیں گے۔وہ ظاہری واقعات میں اُس کے معنوی پہلوؤں کو دریافت کریں گے۔ وہ کسی چیز کو صرف اُس کے ظاہر (face-value) پر نہ لیں گے۔ بلکہ وہ اُس کی گہرائی تک اُتر کر اُس کی اصل حقیقت کو معلوم کریں گے۔

یہ صلاحیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ محرومی کے واقعہ کو تجربہ میں ڈھال لے۔ وہ معلومات کو سبق بنا سکے۔ وہ حال میں مستقبل کو دیکھ لے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی آدمی کو مفکر (thinker) بناتی ہے۔یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی آدمی کو مدبّر کا درجہ عطا کرتی ہے۔اس صلاحیت کے بغیر ایک آدمی صرف عالم ہے،مگر اس صلاحیت کے ساتھ وہ ایک تخلیقی عالم بن جاتا ہے۔

منی مینجمنٹ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں بتایا گیا ہے کہ تم اپنی کمائی کو کس طرح اور کن مدوں میں خرچ کرو۔ اس سلسلہ میں قرآن کی دو آیتیں یہ ہیں:

> اور رشتہ دار کو اُس کا حق دو اور مسکین کو اور مسافر کو اور فضول خرچی نہ کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔(بنی اسرائیل ۲۶۔۲۷)

قرآن کی اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے اُس کو دوسرے لفظوں میں منی مینجمنٹ کہا جا سکتا ہے۔ یعنی اپنی کمائی کو حقیقی ضرورت کے مطابق با اصول انداز میں خرچ کرنا اور بے فائدہ کاموں میں اپنا پیسہ خرچ کرنے سے بچنا۔فضول خرچی کے معاملہ میں قرآن اتنا زیادہ سنجیدہ ہے کہ اُس نے فضول خرچی کو

ایک شیطانی فعل قرار دیا ہے۔

پیسہ کمانا جس طرح ایک کام ہے اسی طرح پیسہ کو خرچ کرنا بھی ایک کام ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے پیسے کو درست طور پر خرچ کرے۔ وہ اپنے پیسہ کو ضائع نہ کرے۔ پیسہ کو درست طور پر خرچ کرنا یہ ہے کہ خرچ کی ضروری مَد اور غیر ضروری مَد میں فرق کیا جائے۔ پیسہ کو صرف ضروری مَد میں خرچ کیا جائے اور غیر ضروری مدوں میں پیسہ کو خرچ کرنے سے مکمل طور پر پرہیز کیا جائے۔

قرآن کی اس آیت میں فضول خرچی کو تبذیر کہا گیا ہے، یعنی پیسہ کو غیر ذمہ دارانہ طور پر بکھیرنا۔ اس قسم کی روش ایک تباہ کُن روش ہے۔ پیسہ کسی کو اس لیے ملتا ہے کہ وہ اُس سے اپنی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرے اور جو پیسہ اپنی حقیقی ضرورت سے زیادہ ہو اُس کو سماج کی تعمیری مدوں میں خرچ کرے۔ یہی خرچ کی صحیح صورت ہے اور اسی میں فرد اور سماج کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

قرآن میں مال کو قیام (النساء ۵) کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مال زندگی کی تعمیر کے سلسلہ میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مال ہر انسان کے پاس خدا کی ایک امانت ہے۔ جو لوگ مال کو غیر ذمہ دارانہ طور پر خرچ کریں وہ بیک وقت دو سنگین برائیوں میں مبتلا ہیں۔ ایک اعتبار سے وہ ایک مقدس امانت میں خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں اور دوسرے اعتبار سے وہ خود اپنی ذاتی تعمیر کے معاملہ میں بدترین ناعاقبت اندیشی کا شکار ہیں۔

انسانی علم کی محدودیت

قرآن کی سورہ نمبر ۱۷ میں کچھ لوگوں کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک علمی حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کا متعلقہ بیان یہ ہے:

> اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو صرف علم قلیل دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی محدودیت (limitations) کی بنا پر علم کلی تک نہیں پہنچ سکتا۔ علم کلی بطور واقعہ موجود ہے۔ مگر انسان کی ذاتی محدودیت کی بنا پر وہاں تک اُس کی

رسائی ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لے۔ وہ جزئی علم کی بنیاد پر کلی علم کے بارہ میں استنباط کرے۔ اگر انسان نے یہ اصرار کیا کہ ہر چیز کو براہِ راست میرے مشاہدہ میں آنا چاہئے تو وہ صرف کنفیوژن کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ کیوں کہ کلّی حقیقت کا بطور مشاہدہ علم میں آنا اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

یہ ایک اہم تعلیم ہے۔ یہی واحد چیز ہے جو آدمی کو کنفیوژن سے بچانے والی ہے۔ جو لوگ یہ چاہیں کہ ہر چیز اُن کے براہ راست مشاہدہ میں آئے، اُسی وقت وہ اُس کو مانیں گے تو ایسے لوگ ہمیشہ بے یقینی کا شکار رہیں گے۔ اس دنیا میں یقین کے درجہ تک پہنچنا صرف اُس انسان کے لیے ممکن ہے جو حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ایسا کرے کہ وہ جزئی علم تک براہِ راست رسائی حاصل کرنے کے بعد یہ اعتراف کرلے کہ اس کے بعد براہ راست علم کی حد ختم ہوگئی اور بالواسطہ علم کی حد آگئی۔ یہی واحد طریقہ ہے جو کسی آدمی کو یقین کا درجہ عطا کرسکتا ہے۔

یہ عین وہی اُصول ہے جس کو موجودہ سائنس میں اب ایک حقیقت کے طور پر مان لیا گیا ہے۔ اب اہل علم کے درمیان یہ ایک مسلّمہ اصول بن چکا ہے کہ سائنس ہم کو سچائی کا صرف ایک حصہ عطا کرتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

اطراف ارض، مرکزِ ارض

قرآن کی سورہ نمبر ۲۱ میں وقت کے اُن بااقتدار لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے جو پیغمبر کی مخالفت کر رہے تھے اور اُس کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اُس کے اطراف سے گھٹاتے چلے جارہے ہیں پھر کیا یہی لوگ غالب رہنے والے ہیں (الانبیاء ۴۴)

قرآن کی اس آیت سے فطرت کا ایک اُصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُصول یہ ہے کہ اطراف پر قبضہ کرتے ہوئے مرکز تک رسائی حاصل کرنا۔ یہ کسی کے خلاف عمل کا سب سے زیادہ کامیاب طریقہ ہے۔ مقابلہ کی صورت میں اگر ایسا کیا جائے کہ شروع ہی میں براہ راست اقتدار کے مرکز سے ٹکراؤ

شروع کر دیا جائے تو یہ سخت نقصان کا باعث ہوگا۔ اس طریقِ کار میں فائدہ کی امید کم اور نقصان کی امید زیادہ ہے۔

عملی اقدام کی زیادہ مؤثر تدبیر یہ ہے کہ اطراف کے شعبوں سے اپنی جدو جہد کا آغاز کیا جائے۔ اطراف سے چل کر مرکز تک پہنچا جائے۔ غیر سیاسی اداروں میں نفوذ حاصل کرتے ہوئے سیاسی ادارہ پر مؤثر بننے کی کوشش کی جائے۔ یہ طریقہ کامیابی کا یقینی طریقہ ہے۔ اس کے برعکس دوسرا طریقہ نقصان اور ناکامی کا طریقہ۔

اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ اکثر حالات میں کسی کے خلاف براہ راست کارروائی مفید نہیں ہوتی۔ اکثر حالات میں زیادہ مفید طریقہ یہ ہے کہ بالواسطہ انداز میں اپنی کوشش شروع کی جائے۔ براہِ راست کارروائی کے مقابلہ میں بالواسطہ کارروائی کا انداز اکثر حالات میں زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

ملاقات کا صحیح طریقہ

قرآن کی سورہ نمبر ۲۴ میں باہمی ملاقات کے آداب بتاتے ہوئے ایک تعلیم یہ دی گئی ہے کہ ملاقات کے لیے پیشگی اجازت کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ مذکورہ قرآنی آیت ہے:

> اے ایمان والو، تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرلو اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے تا کہ تم یاد رکھو (النور ۲۷)

قرآن کی اس آیت میں ملاقات سے پہلے اپائنٹمنٹ (appointment) لینے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی ایک شخص جب دوسرے شخص سے ملنا چاہے تو اُس کے یہاں جانے سے پہلے پیشگی طور پر وہ باقاعدہ اُس سے اجازت حاصل کرے اور پھر اُس کے یہاں ملنے کے لیے جائے۔ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کسی کے یہاں ملاقات کے لیے اچانک پہنچ جائے۔ اس سے سماجی زندگی میں مختلف قسم کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ حتی کہ خود ملاقات کا مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اگر بالفرض کوئی شخص پیشگی اجازت نامہ کے بغیر کسی کے ہاں ملنے کے لیے پہنچ جائے تو اُس کے اندر یہ حوصلہ ہونا

چاہیے کہ اگر متعلقہ شخص اپنے کسی عذر کی بنا پر ملاقات نہ کر سکے یا ملاقات کے لیے بہت کم وقت دے تو فریق اول کو اس پر کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ اُس کو چاہئے کہ وہ اگلی ملاقات کے لیے دوبارہ وقت لے کر بلا شکایت واپس چلا جائے۔ یہ انسانیت کا اعلیٰ طریقہ ہے اور اعلیٰ طریقہ کے بغیر کبھی انسانیت کی اعلیٰ ترقی نہیں ہوسکتی۔

جس طرح ہر چیز کے آداب ہیں، اُسی طرح ملاقات کے بھی آداب ہیں۔ ملاقات کے آداب میں سے یہ ہے کہ متعلقہ شخص سے اُس کی پیشگی اجازت لی جائے۔ گفتگو کے وقت سُنانے کے ساتھ سننے کا بھی مزاج ہو۔ غیر ضروری سوال یا بے فائدہ تفصیل سے بچا جائے۔ تنقید اور تعریف سے بُلند ہو کر بات کو سُنا جائے۔ اپنی رعایت کے ساتھ دوسرے کی رعایت کا بھی پورا لحاظ رکھا جائے۔ گفتگو آہستہ انداز میں کی جائے۔ گفتگو کے وقت زور زور سے بولنا آدابِ کلام کے خلاف ہے۔

ٹکراؤ سے اعراض

قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں قدیم قوم سبا کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس واقعہ سے اجتماعی زندگی کا ایک اہم اُصول معلوم ہوتا ہے۔ اُس کی متعلقہ آیتیں یہ ہیں:

ملکۂ سبا نے کہا کہ اے دربار والو، میری طرف ایک باوقعت خط ڈالا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی طرف سے ہے۔ اور وہ ہے — شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے کہ تم میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے پاس آجاؤ۔ ملکہ نے کہا کہ اے دربار والو، میرے معاملہ میں مجھے رائے دو۔ میں کسی معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی جب تک تم لوگ حاضر نہ ہو۔ اُنہوں نے کہا، ہم لوگ زور آور ہیں اور سخت لڑائی والے ہیں۔ اور فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔ پس آپ دیکھ لیں کہ آپ کیا حکم دیتی ہیں۔ ملکہ نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو خراب کر دیتے ہیں اور اُس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہی یہ لوگ کریں گے۔ (النمل ۲۹۔ ۳۴)

اس آیت میں ملکۂ سبا کے حوالہ سے زندگی کا ایک اُصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اقدام ہمیشہ نتیجہ کو دیکھ کر کرنا چاہئے، نہ کہ محض خواہش کی بنیاد پر۔ کسی کے خلاف اقدام کرنا اگر مثبت نتیجہ پیدا کرنے والا ہو

تو ایسے اقدام کو درست کہا جا سکتا ہے مگر جو اقدام اُلٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (counter productive) ہو، اُس سے بچنا لازمی طور پر ضروری ہے۔

عملی اقدام آئیڈیلزم کے تحت نہیں ہوتا بلکہ پریکٹکل کے تحت ہوتا ہے۔ اپنا ذاتی معاملہ ہو تو آدمی آئیڈیل بن سکتا ہے مگر اجتماعی معاملہ میں ہر ایک کو پریکٹکل ہی بننا ہے، خواہ وہ کوئی عام آدمی ہو یا کوئی حکمراں ہو۔

قابلِ اعتماد کارکن

قرآن کی سورہ نمبر ۲۸ میں ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اس کے ذیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی مقصد کے لیے اچھے کارکن کا انتخاب کرنا ہو تو اس کے اندر کن صفات کو دیکھنا چاہیے۔ قرآن کی متعلقہ آیت یہ ہے: ''ان میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ، اس کو ملازم رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو'' (القصص ۲۶)

قرآن کی اس آیت میں قابل اعتماد کارکن کی صفت کو بتانے کے لیے دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ایک، قوی (Hard worker) اور دوسرے، امین (Honest) یہ دونوں صفتیں ابدی صفتیں ہیں۔ خواہ کسی بھی زمانہ میں اور خواہ کسی بھی کام کے لیے کارکن کا انتخاب کرنا ہو تو انہی دونوں کی حیثیت بنیادی صفت کی رہے گی۔ جو نظام ان دو صفتوں کے حامل افراد کو حاصل کر لے اس کی کامیابی اور ترقی بلاشبہہ یقینی ہے۔

قوت کا تعلق کارکن کی جسمانی طاقت سے ہے اور امانت کا تعلق اُس کے مزاج سے۔ یہی دونوں چیزیں کسی کارکن کو اچھا کارکن بناتی ہیں۔ اچھا کارکن وہ ہے جو ایک طرف محنتی ہو اور دوسری طرف اُس کے اندر یہ مزاج ہو کہ وہ ٹائم کی اہمیت کو جانے اور اپنی ڈیوٹی میں کمی کو برداشت نہ کر سکے۔

صبر سے امامت

قرآن کی سورہ نمبر ۳۲ میں ایک گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کو خدا نے لیڈرشپ عطا کی۔ وہ اس سرفرازی کے مستحق کیسے قرار پائے اس کا راز صبر تھا۔ قرآن کی مذکورہ آیت یہ ہے:

’’اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے جب کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے‘‘ (السجدہ ۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کامیاب قیادت کا راز صبر ہے۔ صبر کسی آدمی کو دوسروں سے بلند کرتا ہے اور بلند سوچ اور بلند کردار ہی وہ صفتیں ہیں جو کسی آدمی کو دوسروں کے اوپر سرداری کا مقام دیتی ہیں۔

لوگ اسی شخص یا گروہ کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں جو انہیں اپنے سے بلند دکھائی دے۔ جو اس وقت اصول کے لیے جئے جب کہ لوگ مفاد کے لیے جیتے ہیں۔ جو اس وقت انصاف کی حمایت کرے جب کہ لوگ قوم کی حمایت کرنے لگتے ہیں۔ جو اس وقت برداشت کرے جب کہ لوگ انتقام لیتے ہیں۔ جو اس وقت اپنے کو محرومی پر راضی کرلے جب کہ لوگ پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔ جو اس وقت حق کے لیے قربان ہوجائے جب کہ لوگ صرف اپنی ذات کے لیے قربان ہونا جانتے ہیں۔ یہی صبر ہے اور جو لوگ اس صبر کا ثبوت دیں وہی قوموں کے امام بنتے ہیں۔

دشمن میں دوست

قرآن میں فطرت کے جو قوانین بتائے گئے ہیں اُن میں سے ایک قانون یہ ہے کہ کوئی آدمی کبھی کسی کا پیدائشی دشمن نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کی فطرت وہی ہے جو کسی دوسرے آدمی کی ہے۔ اس لیے کسی کو بھی اپنا ابدی دشمن نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس حقیقت کو قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں اس طرح بتایا گیا ہے:

’’اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے خدا کی طرف بُلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہوگیا جیسے کوئی دوست قرابت والا‘‘۔ (حٰم السجدہ ۳۳۔۳۴)

ہر انسان پیدائشی اعتبار سے فطرتِ صحیح پر پیدا ہوتا ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر ویسا ہی ایک انسان ہے جیسا کہ کوئی دوسرا شخص۔ دشمنی جیسی منفی چیزیں انسانی شخصیت کا محض اوپری حصہ ہیں نہ کہ اُس کا داخلی حصہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی آپ کو اپنا دشمن نظر آئے تو اُس کو اپنا مستقل دشمن نہ سمجھئے۔ بلکہ اُس کی دشمنی کو ایک وقتی حالت سمجھیے۔ دشمن کے بارہ میں اگر اس قسم کی مثبت سوچ پیدا ہو جائے تو آدمی اس قابل ہو جائے گا کہ وہ تعصب جیسے جذبات سے اوپر اُٹھ کر دشمن کے معاملہ میں اپنا رویہ متعین کرے۔ جو آدمی اس طرح غیر جذباتی انداز میں اپنے دشمن سے معاملہ کرے تو وہ یقینی طور پر کامیاب ہوگا۔

دشمن کی منفی کارروائیوں کی پروا کیے بغیر اُس کے ساتھ دوستانہ سلوک کرنا دشمن کو بدل دے گا۔ اُس کی شخصیت کے اوپر دشمنی کی جو اوپری تہہ بیٹھ گئی تھی وہ ڈھل جائے گی اور پھر جو شخص بظاہر آپ کا دشمن بنا ہوا تھا وہ آپ کا دوست بن جائے گا۔

مصیبت کا سبب

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا میں شکست اور ناکامی کا سبب کیا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ''اور جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں ہی سے ہے، اور بہت سے قصوروں کو وہ معاف کر دیتا ہے'' (الشوریٰ ۳۰)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ اس قانون کے مطابق، کسی کی دشمنی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ بلکہ یہ خود انسان ہے جو اپنی کوتاہی کی سزا پا رہا ہے۔ ہر مصیبت کا سبب آدمی کے خود اپنے اندر ہوتا ہے، نہ کہ اُس کے باہر۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی آدمی کسی مصیبت یا کسی نقصان سے دوچار ہو تو اُس کو اُس سے نجات پانے کے لیے خود اپنے اندر عمل کرنا چاہیے۔ اُس کو چاہئے کہ وہ اپنی داخلی کمیوں کو تلاش کر کے اُن کی اصلاح کرے۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے مستقبل کو درست کر سکتا ہے۔ اس کے بجائے جو آدمی یہ کرے کہ وہ اپنی مصیبت کا ذمہ دار دوسروں کو بتا کر اُن کے خلاف شکایت اور احتجاج میں مصروف ہو جائے، وہ صرف اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ ایسی کوشش کبھی کسی مثبت نتیجہ تک پہنچنے والی نہیں۔

قرآن کی یہ آیت نتیجہ خیز منصوبہ بندی کے اصول کو بتا رہی ہے۔ اُس کا پیغام یہ ہے کہ آدمی بے نتیجہ کارروائیوں سے اپنے آپ کو بچائے اور صرف نتیجہ خیز سرگرمیوں میں اپنے آپ کو مصروف کرے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کا قانون کبھی کسی کے لیے بدلنے والا نہیں۔

غصہ پی جانا

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں ایک اہم اخلاقی اصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اجتماعی زندگی میں جب ایک آدمی کو دوسرے کے اوپر غصہ آئے تو اس کو چاہئے کہ وہ غصہ کو پی جائے اور اس کو معاف کردے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کردیتے ہیں'' (الشوریٰ ۳۷)

غصہ ایک غیر فطری حالت ہے۔ جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کا دماغ اپنی فطری حالت پر باقی نہیں رہتا۔ وہ معتدل انداز میں سوچنے پر قادر نہیں رہتا۔ غصہ میں مبتلا انسان نہ درست طور پر سوچ پاتا اور نہ درست طور پر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرسکتا۔ غصہ کسی آدمی کا اعتدال چھین لیتا ہے۔ وہ اس کو غیر معتدل انسان بنا دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غصہ کو پی جانا خود اپنے آپ کی حفاظت کرنا ہے۔ غصہ کو پی جانا اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی حقیقت پسندانہ انداز میں سوچے۔ وہ زیادہ نتیجہ خیز انداز میں اپنی کارروائی کی منصوبہ بندی کرے۔ غصہ کو پی جانا خارجی اعتبار سے ایک اخلاقی سلوک ہے۔ مگر داخلی اعتبار سے وہ اپنی تعمیر کے ہم معنیٰ ہے۔ جب کوئی آدمی غصہ کے حالات میں غصہ نہ کرے تو وہ اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ وہ اپنی قوت کو منفی رُخ پر جانے سے روکتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے وسائل کو بھرپور طور پر صرف اپنی تعمیر میں لگائے۔ دوسرے کی تخریب میں غیر ضروری طور پر وہ اپنے وسائل کا کوئی حصہ ضائع نہ کرے۔

مشورہ مفید ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں جو تعلیمات دی گئی ہیں اُن میں سے ایک تعلیم وہ ہے جس کو مشورہ کہا

جاتا ہے۔ قرآن میں اہل حق کی صفات میں سے ایک صفت اسی مشورہ کو بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

''اور وہ اپنا کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں'' (الشوریٰ ۳۸)

مشورہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی معاملہ میں حل تلاش کرنے کے کام کو اجتماعی بنا دیا جائے۔ اپنی سمجھ کے ساتھ دوسروں کی سمجھ کو اُس میں شامل کرلیا جائے۔ مشورہ کا مطلب گویا انفرادی عقل کو اجتماعی عقل بنا دینا ہے۔

مشورہ میں یہ ہوتا ہے کہ کئی آدمی کسی موضوع پر ڈسکشن کرتے ہیں۔ اس طرح کے ڈسکشن کے فائدوں میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ معاملہ کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مشورہ اگر کھلے ذہن کے ساتھ کیا جائے اور تنقید اور تعریف کے جذبہ سے بُلند ہو کر اُس کو سُنا جائے تو مشورہ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ مشورہ میں جو فائدے ہیں اُن کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ لوگ تحفظ ذہنی کے ساتھ نہ بولیں بلکہ وہ جو کچھ کہیں کھُلے ذہن کے ساتھ کہیں اور سننے والے بھی اُس کو کھلے ذہن کے ساتھ سنیں۔

یہ سب مشورہ کے آداب ہیں۔ جس مشورہ میں ان آداب کو ملحوظ رکھا جائے وہ مشورہ بے حد بابرکت بن جاتا ہے۔ مشورہ کو اگر حسنِ نیت کے ساتھ کیا جائے تو وہ ایک عبادت ہے۔ مشورہ دین اور دنیا دونوں قسم کے فائدوں کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے اصحاب کے ساتھ کھلا مشورہ کرتے تھے اور لوگ کسی پابندی کے بغیر اپنی رائے دیتے تھے۔

ماننے سے پہلے تحقیق

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں اجتماعی زندگی کے بارہ میں ایک اُصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ کسی بات کو صرف سُن کر نہ مان لیا جائے۔ مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے''
(الحجرات ٦)

لوگ جب مل جُل کر رہتے ہیں تو اجتماعی زندگی کے نتیجہ میں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اُن میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی طرف سے بار بار خبریں پہنچتی ہیں۔ ان خبروں پر سننے والے کا ردعمل کیا ہونا چاہئے اسی کی بابت ایک اصول مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے۔ وہ اُصول یہ ہے کہ سننے والا جب کسی بات کو سُنے تو ماننے سے پہلے اُس کی تحقیق کرے۔ تحقیق کے بغیر صرف سننے کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہ کی جائے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر ایک کی بات دوسرے تک صحیح شکل میں نہیں پہنچتی۔ بات کو پہنچانے والا درمیانی شخص اکثر بات کو بدل دیتا ہے۔ مزید یہ کہ ہر بات کا ایک بیک گراؤنڈ یا موقع ومحل ہوتا ہے۔ مگر بات کو نقل کرنے والا اکثر ایسا کرتا ہے کہ وہ بیک گراؤنڈ کو بتائے بغیر مجرد شکل میں بات کو بیان کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے کچھ ہوتی ہے اور سننے والے تک پہنچ کر وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر سننے والا آدمی غلط رائے قائم کرتا ہے اور غلط اقدام کر ڈالتا ہے جس کا نتیجہ آخرکار اس صورت میں نکلتا ہے کہ آدمی اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے، حالاں کہ اب وقت اُس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ ہر سماج میں پیش آتا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر یہ مزاج بنائے کہ وہ صرف سن کر کسی بات کو نہ مان لے۔ ماننے سے پہلے وہ ضروری تحقیق کرے۔ اور اگر وہ تحقیق نہیں کر سکتا تو ایسی حالت میں اُس کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ سُنی ہوئی بات کو بھلا دے۔ وہ اُس پر نہ کوئی رائے قائم کرے اور نہ اُس کی بنیاد پر کسی اقدام کا منصوبہ بنائے۔

کلام کے آداب

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں کچھ اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں۔ یہ اخلاقی ہدایات کلام کے آداب سے متعلق ہیں۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو''۔ (الحجرات ۱۱)

قرآن کی اس آیت میں اُس اجتماعی مسئلہ کا ذکر ہے جو اکثر ایک اور دوسرے کے درمیان اختلاف کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اختلاف پیش آتے ہی دوسرے کو غلط اور اپنے کو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ اس نفسیات کے تحت یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کا مذاق اُڑانے لگتا ہے۔ وہ اُس کے خلاف تحقیری الفاظ بولتا ہے۔ وہ اُس کی طعنہ زنی کرتا ہے۔ وہ اُس کو بُرے نام سے پکارنے لگتا ہے۔ وہ اُس کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیزیں سماج کے اندر آپس کے تعلقات میں کڑواہٹ پیدا کردیتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے متنفر ہوجاتے ہیں۔ خوشگوار باہمی تعلقات کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہ ایک سماجی بگاڑ ہے جس کا بُرا نتیجہ ہر ایک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگ صرف رایوں کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے بارہ میں بُرا گمان قائم نہ کریں۔ اختلاف کے وقت لفظی ریمارک دینے سے مکمل پرہیز کریں۔ اس کے بجائے وہ ایسا کریں کہ جب کسی سے اختلاف پیدا ہو تو سنجیدگی اور غیر جانبداری کے ساتھ اُس پر غور کریں اور پھر اپنی بات کو دلیل کے انداز میں بیان کریں۔ علمی تنقید میں کوئی حرج نہیں مگر ذاتی تنقیص یقینی طور پر بری چیز ہے اور انسان کی اجتماعی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

اجتماعی زندگی میں لوگوں کا سابقہ ایک دوسرے کے ساتھ جس چیز میں پڑتا ہے وہ زبان ہے۔ زبان کا غلط استعمال آپس میں تلخی پیدا کردیتا ہے اور زبان کا درست استعمال آپس میں محبت کو بڑھاتا ہے۔ زبان سے آدمی صرف کچھ الفاظ بولتا ہے مگر یہ الفاظ عملی اعتبار سے بڑے بڑے نتائج پیدا کرتے ہیں، اچھے بھی اور بُرے بھی، خواہ خاندانی زندگی ہو یا وسیع تر معنوں میں سماجی زندگی، ہر جگہ زبان کا استعمال بے حد اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ زبان کے استعمال میں بے حد محتاط رہے۔

ذہنی کنڈیشننگ کی ضرورت

قرآن کی سورہ نمبر ۵۰ میں آخرت کا ایک منظر بتایا گیا ہے۔ حق کے منکرین دوبارہ زندہ ہو کر خدا کے سامنے لائے جائیں گے۔ اُس وقت خدا اُن سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے گا—

وجاءت كل نفس معها سائق وشهيد، لقد كنت في غفلة من هذا فكشفنا

عنك غطاءك فبصرك اليوم حديد :

''ہرشخص اس طرح آگیا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ تم اس سے غفلت میں رہے، پس ہم نے تمہارے اوپر سے پردہ ہٹادیا، پس آج تمہاری نگاہ تیز ہے''۔ (ق ۲۱۔۲۲)

قرآن کی ان آیتوں میں جس معاملہ کا ذکر ہے اُس کو انسانی زبان میں کنڈیشننگ اور ڈی کنڈیشننگ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ آدمی اپنے بچپن میں اور جوانی کی عمر میں ذہنی اعتبار سے غیر پختہ (immature) ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں وہ تجزیہ کرنے اور صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر آدمی اپنے ماحول کے اعتبار سے متاثر ذہن بن جاتا ہے۔ اسی کو نفسیات کی اصطلاح میں کنڈیشننگ (conditioning) کہتے ہیں۔

اس کنڈیشننگ کی بنا پر آدمی اس قابل نہیں رہتا کہ وہ چیزوں کو بے آمیز صورت میں دیکھ سکے۔ وہ چیزوں کو ویسا نہیں دیکھتا جیسا کہ وہ ہیں۔ بلکہ وہ چیزوں کو اُس طرح دیکھتا ہے جیسا کہ اُس کا ذہن اُس کو دکھانا چاہتا ہے۔

اس لیے صحیح طرزِ فکر یا آبجیکٹیو تھنکنگ (objective thinking) کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے ذہن کے اوپر پڑے ہوئے مصنوعی پردوں کو ایک ایک کرکے ہٹادے۔ خود احتسابی کا یہ عمل ہر آدمی کو لازماً کرنا ہے۔ اس ڈی کنڈیشننگ کے بغیر کوئی آدمی اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ حقیقت بیں بنے، وہ چیزوں کے بارہ میں بالکل درست رائے قائم کرسکے۔

لالچ کا نقصان

قرآن کی سورہ نمبر ۵۹ میں ایک ایسی اخلاقی بُرائی کی نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی کامیابی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں'' (الحشر ۹)

لالچ (شُحّ نفس) کیا ہے۔ یہ دراصل دل کی تنگی ہے۔ یہ دل کی تنگی سے پیدا ہونے والی صفت کا دوسرا نام ہے۔ انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ـــ تنگ دل اور فراخ دل۔ تنگ دل انسان وہ ہے جو اپنی ذات کے دائرہ میں سوچے۔ جس کا مقصد صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا ہو۔ یہی وہ آدمی ہے جو لالچ یا شحِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

کوئی شخص جب بھی کوئی فائدہ حاصل کرتا ہے تو وہ سماج کے مجموعی تعاون کی مدد سے حاصل کرتا ہے۔ ایسی حالت میں لالچ یا تنگ دلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے لیے تو سماج سے لینا چاہتا ہے مگر وہ خود سماج کو دینا نہیں چاہتا۔ اس قسم کی خود غرضی کبھی کسی کے لیے مفید نہیں ہو سکتی، نہ فرد کے لیے اور نہ قوم کے لیے۔

اس دنیا میں کامیابی صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو کھلا دل رکھتے ہوں۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ ـــ جتنا بڑا دل اُتنی بڑی کامیابی۔ بڑے دل والا آدمی اس بات کا حوصلہ رکھتا ہے کہ وہ دوسروں کی رعایت کرے۔ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر خوش ہو۔ وہ شکایت کے باوجود دوسروں کے ساتھ بہتر معاملہ کرے۔ وہ معاملات کو بُلند سطح سے دیکھے۔ جس آدمی کے اندر یہ اعلیٰ صفات ہوں وہ لوگوں کے درمیان باعزت درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور جو آدمی دوسروں کے درمیان باعزت درجہ حاصل کر لے اُس کی کامیابی کو کوئی روکنے والا نہیں۔

ایثارِ نفس

قرآن کی سورہ نمبر ۵۹ میں اعلیٰ انسانوں کی صفات بتائی گئی ہیں۔ ان اعلیٰ صفات میں سے ایک صفت ایثارِ نفس ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں۔ اگر چہ اُن کے اوپر فاقہ ہو'' (الحشر ۹)

ایثارِ نفس ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ ایثارِ نفس کا مطلب ہے، اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا۔ اپنے حق میں کمی کر کے دوسرے کا حق پورا کرنا۔ یہ صفت ایک فرد کے لیے اعلیٰ انسانیت کا مظاہرہ ہے، اور سماجی اعتبار سے وہ سماج کی مجموعی ترقی کا ضامن ہے۔

انسانیت کی مجموعی ترقی کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی صفت ہے۔ جس سماج کے افراد میں یہ مزاج ہو کہ وہ اپنے آپ کو بھلا کر دوسرے کی مدد کریں۔ وہ اپنی سیٹ کو خالی کر کے دوسرے کو بیٹھنے کی جگہ دیں۔ وہ دوسرے کی خوبی کا اعتراف کر کے اُس کو آگے بڑھائیں تو ایسے سماج میں مجموعی ترقی کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

جس سماج میں یہ صفت ہو اُس میں آپس کی محبت بڑھے گی۔ لوگ ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے پر تیار رہیں گے۔ سماج کے لوگوں میں حسد اور بُغض اور خودغرضی جیسی برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ ایسے سماج میں اعلیٰ اخلاقی اوصاف پرورش پائیں گے۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے خیر خواہی ہوگی۔ ایسا سماج گویا ایک خاندان کی مانند ہوگا جس میں لوگ بھائی بہن کی طرح مل کر رہیں گے۔

ایثار نفس بظاہر ایک قربانی ہے۔ مگر اُسی میں ذاتی فائدہ کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ جو آدمی دوسروں کے ساتھ ایثار کا معاملہ کرے وہ دوسروں کے دل کو جیت لیتا ہے، اور جب دلوں کو جیت لیا جائے تو اُس کے بعد کوئی اور چیز جیتنے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

اعلیٰ اخلاق

قرآن کی سورہ نمبر ۶۸ میں اعلیٰ اخلاق اور بُلند کردار اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اُس کو انسانیت کا اعلیٰ مرتبہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو'' (القلم ۴)

اس آیت میں بظاہر رسول سے خطاب ہے۔ مگر وہ ہر انسان کے لیے ایک عمومی تعلیم ہے۔ وہ ہر انسان کو اعلیٰ انسان بننے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویّہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اُس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ بُرائی کرنے والوں کے ساتھ بُرائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی، بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے۔ خواہ دوسرے اُس کے ساتھ برائی ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

اعلیٰ انسان کا اخلاق یہی دوسرا اخلاق ہوتا ہے۔ اس قسم کا اخلاق کسی انسان کے بارہ میں یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک با اُصول انسان ہے۔ ایسا اخلاق اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کی شخصیت حالات کی پیداوار نہیں بلکہ وہ خود اپنے اختیار کردہ اعلیٰ اصول کی پیداوار ہے۔ جس انسان کے اندر اس قسم کا اعلیٰ اخلاق ہو وہی حقیقی انسان ہے اور جس آدمی کے اندر یہ اعلیٰ اخلاق نہ پایا جائے وہ انسان کی صورت میں ایک حیوان ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اعلیٰ اخلاق کی صفت انسان کو حیوان سے جُدا کرتی ہے۔ حیوان مساویانہ اخلاق کی سطح پر جیتے ہیں۔ کوئی اُن کو نہ چھیڑے تو وہ بے ضرر رہیں گے اور اگر کوئی اُن کو چھیڑ دے تو وہ اُس کے لیے ضرر رساں بن جائیں گے۔ اعلیٰ انسانی اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویّہ سے بُلند ہو کر اپنا رویہ بنائے۔ دوسرے لوگ خواہ اُس کے ساتھ اچھے نہ ہوں مگر وہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اچھا معاملہ کرے۔

ناپ تول میں فرق کرنا

قرآن کی سورہ نمبر ۸۳ میں زندگی کی ایک حقیقت کا بیان ہے۔ قرآن میں اس کو تطفیف کے لفظ میں بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی مذکورہ آیت یہ ہے:

''خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں۔ اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں'' (التطفیف ۱۔۳)

قرآن کی اس آیت میں ناپ اُور تول کی مثال سے ایک سماجی بُرائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں اُس کردار کا ذکر ہے جس کا یہ حال ہو کہ اُس کو جب اپنے لیے لینا ہو تو وہ بھرپور طور پر لے۔ اور جب دوسروں کو دینا ہو تو وہ کمی کر کے دوسروں کو دے۔ یہ تفریق ایک ایسی اخلاقی بُرائی ہے جو آدمی کو تباہی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتی۔

اس معاملہ کا تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ مثلاً خود اپنی تعریف سننے کا حریص ہونا مگر دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں بُخل کرنا۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے خوب ہوشیار ہونا مگر دوسروں کے مفاد کو سمجھنے کے لیے نادان بن جانا۔ معاملات میں اپنے لیے رعایت چاہنا اور دوسروں

کو رعایت دینے کے لیے تیار نہ ہونا۔ اپنی ذات کے معاملہ میں حساس ہونا اور جب معاملہ دوسروں کا ہوتو بے حس بن جانا۔ اپنے لیے انصاف چاہنا اور دوسروں کے ساتھ بے انصافی پر راضی رہنا۔ یہ تو جاننا کہ مجھے کیا پسند ہے، مگر دوسروں کی پسند اور ناپسند کے بارہ میں بے خبر رہنا۔ اپنی عزت خطرہ میں ہوتو اُس کو برداشت نہ کرنا مگر دوسروں کی عزت پر حملہ ہوتو اُس کے بارہ میں بے حس بن جانا، وغیرہ۔

اپنے اور غیر میں اس قسم کا ہر فرق تطفیف ہے۔ جس آدمی کے اندر اس قسم کا مزاج ہو وہ کبھی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس قسم کا مزاج آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش رُک جائے اُس کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی ترقی کے اعلیٰ مراحل طے کرنے سے محروم رہے اور آخر کار وہ اسی حال میں مرجائے۔

مشقتوں کے درمیان

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ اس قانون کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، خواہ وہ بظاہر اچھے ہوں یا بُرے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے:

''ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے'' (البلد ۴)

قرآن کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں انسان کے ساتھ بار بار پُر مشقت حالات پیش آئیں، اُس کو مختلف قسم کی مشکلات سے گذرنا پڑے۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ کسی بھی تدبیر کے ذریعہ اس قانون کو بدلا نہیں جاسکتا۔ ہر انسان کو لازماً اس امتحان سے گذرنا ہے۔ مشقتوں سے باہر اپنے سفر کے لیے کوئی آسان راستہ ممکن نہیں۔

زندگی کو اس نہج پر کیوں بنایا گیا۔ یہ خود انسان کے فائدے کے لیے ہے۔ مشقتیں انسان کو انسان بناتی ہیں۔ مشقتیں انسانی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔ مشقتوں کے درمیان انسان کو وہ سبق اور وہ تجربہ حاصل ہوتا ہے جو اُس کے ذہنی ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔

مشکلات انسان کے ذہن کو جگاتی ہیں۔ مشکلات انسان کو سنجیدہ بناتی ہیں۔ مشکلات انسان کو

حقیقت پسند بنانے کا ذریعہ ہیں۔ مشکلات سے گذرنے کے بعد انسان کے اندر وہ اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کو احتیاط، ضبط نفس، ڈسپلن، احساسِ ذمہ داری اور اعتراف کہا جاتا ہے۔ جو لوگ مشقت کے کورس سے نہ گذریں وہ سطحی انسان بن کر رہ جائیں گے۔ ایسے لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

مشقت اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی مصیبت یا برائی نہیں، مشقت انسانی زندگی کے لیے ایک ترقیاتی کورس ہے۔ جو انسان مشقتوں کا تجربہ نہ کرے وہ زندگی کی گہری حقیقتوں سے بے خبر رہے گا۔ مشقت ایک کورس ہے جو آدمی کو گہری حقیقتوں سے واقف کراتا ہے۔ وہ آدمی کے چھپے ہوئے امکانات کو ظہور میں لاتا ہے۔ وہ کسی آدمی کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ مشقت زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کے ہم معنٰی ہے۔ مشقت ہر قسم کی ترقیوں کا زینہ ہے، جہاں مشقت نہیں وہاں ترقی بھی نہیں۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورہ نمبر ۹۴ میں فطرت کے ایک اٹل قانون کا بیان ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر خاتمہ ایک نئے امکان کو لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کسی کے لیے کسی بھی حال میں مایوسی کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کا بیان یہ ہے:

''پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے'' (الانشراح ۵۔۶)

قرآن کی اس آیت میں فطرت کے ایک راز کو کھولا گیا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی مسئلہ کبھی اکیلا نہیں آتا۔ وہ اپنا حل بھی اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ اس دنیا میں ہر ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ ایڈوانٹج موجود ہے۔ اس دنیا میں ہر مائنس پوائنٹ کے ساتھ پلس پوائنٹ شامل ہے۔ اس دنیا میں ہر نقصان کے ساتھ فائدہ کا ایک امکان چھپا ہوا ہے۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں کوئی حالت یکساں طور پر باقی نہ رہے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہر تاریکی اپنے ساتھ روشنی لے آتی ہے۔ اس

لیے آدمی کو چاہئے کہ اُس کو کوئی سٹ بیک (set back) پیش آئے تو وہ نہ گھبرائے اور نہ وہ مایوس ہو۔ اگر وہ اپنے ہوش وحواس کو برقرار رکھے تو بہت جلد وہ دوبارہ اپنے حق میں ایک نیا امکان پالے گا۔ وہ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کرکے دوبارہ ترقی اور کامیابی کی منزل پر پہنچ جائے گا۔

انسان کا درجہ

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ میں انسان کے بارہ میں ایک تاریخی قانون کو بتایا گیا ہے۔ بعض تاریخی شہادتوں کو پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور صالح اعمال کیے تو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے''۔ (التین ۴-۶)

قرآن کی ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے امکان (potential) کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مخلوق کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر اس امکانی درجہ تک صرف وہ لوگ پہنچیں گے جو اس تخلیقی اسکیم کو شعوری طور پر سمجھیں اور اُس کے مطابق اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کرسکیں وہ سارے امکان کے باوجود محرومی کا کیس بن کر رہ جائیں گے۔

اپنے امکان کو واقعہ بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی غور وفکر کے ذریعہ اپنے بارہ میں تخلیق کے نقشہ کو سمجھے۔ پھر وہ اس تخلیقی نقشہ سے کامل رعایت کرتے ہوئے اُس کے مطابق اپنی عملی سرگرمیاں جاری کرے۔ وہ حق اور ناحق میں فرق کرنا جانے، وہ ناحق سے دور رہتے ہوئے اپنے آپ کو حق کا پابند بنائے۔

امکان خدا کا عطیہ ہے۔ مگر امکان کو واقعہ بنانا انسان کا ذاتی فعل ہے۔ جو آدمی اپنے ذاتی حصہ کی ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہوگیا، کوئی دوسری چیز اُس کو اس انجام سے بچانے والی نہیں۔

علم سے آغاز

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ۶۱۰ء میں آپ پر خدا کی طرف سے پہلی وحی اُتری۔ یہ ابتدائی کلام جو خدا کی طرف سے آپ کو ملا وہ یہ تھا:

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو علق سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا''۔ (العلق ۱۔۵)

قرآن میں اترا ہوا یہ پہلا کلام الٰہی بتاتا ہے کہ کسی حقیقی عمل کا آغاز کیا ہے۔ یہ آغاز علم ہے۔ یعنی انسان کو باشعور بنانا۔ انسان کے اندر ذہنی تبدیلی لانا، انسان کے اندر فکری انقلاب پیدا کرنا۔ یہی انسانوں کے درمیان کسی حقیقی تحریک کا آغاز ہے۔ اس دنیا میں وہی انسانی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے جو شعور کی بیداری سے اپنے کام کا آغاز کرے۔

علم طاقت ہے۔ علم اس دنیا میں سب سے بڑا ہتھیار ہے، ایک فرد کے لیے بھی اور پوری انسانیت کے لیے بھی۔ علم کا آغاز مائنڈ سے ہوتا ہے مگر وہ پوری خارجی دنیا کو مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

علم کسی آدمی کی تکمیل ہے۔ علم کے بغیر کوئی انسان ادھورا انسان ہے۔ علم کے بعد وہ مکمل انسان بن جاتا ہے۔ علم سے خالی انسان صرف اپنی ذات کو جانتا ہے۔ علم کے حصول کے بعد آدمی پورے کائنات کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ علم کسی ناقص انسان کو ایک کامل انسان بنا دیتا ہے۔

کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۳ میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو حقیقی تعمیر کے لیے اُس چیز کی ضرورت ہے جس کو ٹائم مینجمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس ٹائم مینجمنٹ کے بغیر کسی کے لیے حقیقی ترقی کو پانا ممکن نہیں۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

''زمانہ گواہ ہے۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی''۔ (العصر ۱۔۳)

قرآن کی اس سورہ میں زندگی کی ایک اہم حقیقت کے بارہ میں انسان کو آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ انسان ہر لمحہ زندگی سے موت کی طرف جا رہا ہے۔ ہر لمحہ انسان کا کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ یہ فطرت کا ایک لازمی قانون ہے۔ اس قانون کو دوبارہ اُلٹی طرف چلایا نہیں جاسکتا۔

مثال کے طور پر ایک شخص کی مقرر عمر اگر ۸۰ سال ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اُس کا کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ ہر سال اس کی عمر میں ایک سال کی کمی کا اعلان ہے۔ گویا کہ اُس کی عمر کا سفر اس طرح ہو رہا ہے — ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰ الخ۔ اسی کاؤنٹ ڈاؤن کو قرآن کی مذکورہ سورت میں خسران کہا گیا ہے۔

آدمی ہر لمحہ اپنی موت کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی مہلت عمر کو استعمال نہ کرے تو آخر کار اُس کے حصہ میں جو چیز آئے گی وہ صرف ہلاکت ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے آدمی کو خود عمل کرنا ہے۔ جب کہ ناکامی کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ اس کی طرف بھاگی چلی آرہی ہے۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط و کتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099
Tel.: 2834 1654/28346079/2821 8609, Fax: 2823 6323
Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

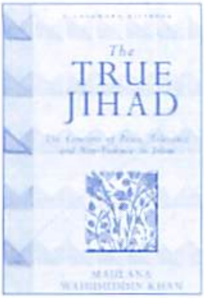
Goodword Books Pvt. Ltd.

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013

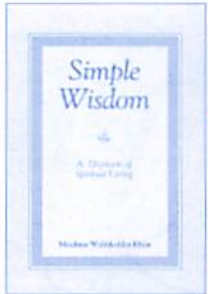
Tel. (9111) 2435 6666, 2435 5454 Fax: (9111) 2435 7333 e-mail: info@goodwordbooks.com

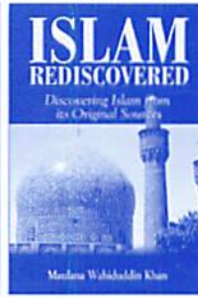
ORDER FORM (URDU BOOKS)

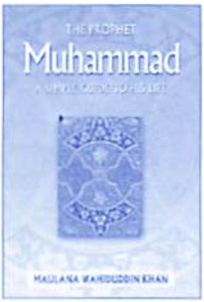
QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES
	60.00	مضامین اسلام		12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)		400.00	تذکیر القرآن (مکمل، مجلد)
	10.00	باغ جنت		80.00	ڈائری (جلد اول)		250.00	تذکیر القرآن (پیپر بیک)
	10.00	نار جہنم		65.00	کتاب زندگی		85.00	اسباق تاریخ
	10.00	سچا راستہ		25.00	اقوال حکمت		60.00	تعمیر حیات
	10.00	دینی تعلیم		10.00	تعمیر کی طرف		50.00	تعمیر انسانیت
	10.00	خلیج ڈائری		20.00	تبلیغی تحریک		125.00	سفرنامہ غیر ملکی اسفار جلد اول
	10.00	رہنمائے حیات		25.00	تجدید دین		125.00	سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم
	10.00	تعدد ازواج		35.00	عقلیات اسلام		80.00	اسلام: ایک تعارف
	60.00	ہندستانی مسلمان		25.00	قرآن کا مطلوب انسان		60.00	اللہ اکبر
	10.00	روشن مستقبل		10.00	دین کیا ہے؟		50.00	پیغمبر انقلاب
	10.00	صوم رمضان		20.00	اسلام دین فطرت		65.00	مذہب اور جدید چیلنج
	8.00	اسلام کا تعارف		10.00	تعمیر ملت		35.00	عظمت قرآن
	20.00	علما اور دور جدید		10.00	تاریخ کا سبق		60.00	عظمت اسلام
	60.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین		8.00	فسادات کا مسئلہ		10.00	عظمت صحابہ
	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے		8.00	انسان اپنے آپ کو پہچان		80.00	دین کامل
	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ		8.00	تعارف اسلام		45.00	الاسلام
	10.00	یکساں سول کوڈ		8.00	اسلام پندرہویں صدی میں		50.00	ظہور اسلام
	10.00	اسلام کیا ہے؟		12.00	راہیں بند نہیں		40.00	اسلامی زندگی
	40.00	میوات کا سفر		10.00	ایمانی طاقت		35.00	احیاء اسلام
	35.00	قیادت نامہ		10.00	اتحاد ملت		65.00	راز حیات
	8.00	منزل کی طرف		20.00	سبق آموز واقعات		40.00	صراط مستقیم
	125.00	اسفار ہند		10.00	زلزلۂ قیامت		60.00	خاتون اسلام
	100.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹		12.00	حقیقت کی تلاش		50.00	سوشلزم اور اسلام
	70.00	قال اللہ و قال الرسول		8.00	پیغمبر اسلام		30.00	اسلام اور عصر حاضر
	90.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱		10.00	آخری سفر		40.00	الربانیہ
	80.00	مطالعۂ قرآن		10.00	اسلامی دعوت		45.00	کاروان ملت
	40.00	مذہب اور سائنس		20.00	حل یہاں ہے		30.00	حقیقت حج
	100.00	دین و شریعت		25.00	امہات المومنین		35.00	اسلامی تعلیمات
	60.00	مطالعۂ سیرت		85.00	تصویر ملت		25.00	اسلام دور جدید کا خالق
	10.00	خدا اور انسان		50.00	دعوت اسلام		40.00	حدیث رسول
	8.00	ہندستان آزادی کے بعد		40.00	دعوت حق		35.00	راہ عمل
	100.00	مسائل اجتہاد		80.00	نشری تقریریں		80.00	تعبیر کی غلطی
	120.00	مطالعۂ حدیث		60.00	دین انسانیت		25.00	دین کی سیاسی تعبیر
				50.00	فکر اسلامی		10.00	عظمت مومن
				50.00	شتم رسول کا مسئلہ		8.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد
				8.00	طلاق اسلام میں		8.00	تاریخ دعوت حق

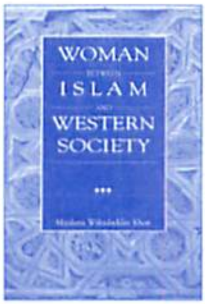


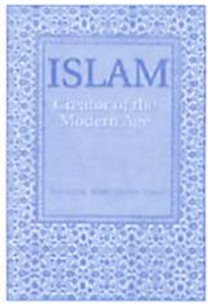


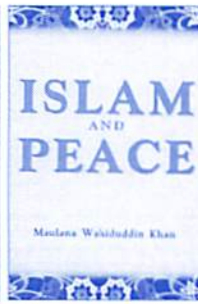


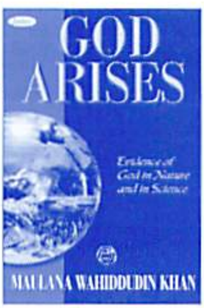


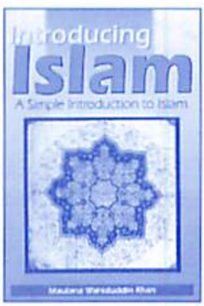


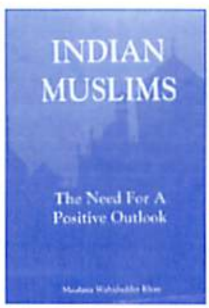






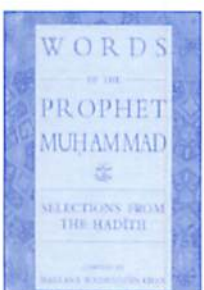


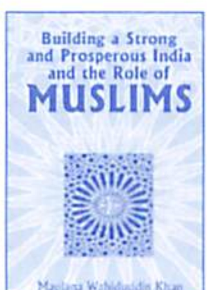














RNI 28822/76 • U(SE) 12/2004
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2004